عشق نے کی راہنمائی یہ بہت اچھا ہوا
جانے کس رستے پہ لے جاتا غبارِ کارواں؟
(ڈاکٹر شہناز مزمل)

زیرِ مطالعہ کتاب نقادو شاعر شبیر ناقدؔ کے ایما پر شائع کی گئی ہے اور اس کے جملہ حقوق اور متن کی تمام تر ذمہ داری انہی کو مستحسن ہے۔ پبلشر یا پرنٹر قطعاً ذمہ دار نہیں۔ ادارہ اردو سخن ڈاٹ کام کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ قارئین تک بہترین اور اغلاط سے پاک ادبی مواد پہنچایا جائے اور اس ضمن میں ہر امکانی کوشش کو بروئے کار لایا جاتا ہے تاہم غلطی کی نشاندہی کا خیر مقدم کیا جاتا ہے تاکہ آئندہ اشاعت میں اس کی درستی کی جائے۔ (ادارہ)

(تنقید و تحقیق)

ڈاکٹر شہناز مزمل کے تخلیقی آفاق

شبیر ناقدؔ

www.urdusukhan.com

اردو سخن

آرٹ لینڈ، گرلز کالج روڈ، اردو بازار چوک اعظم (لیہ) فون: 0302-7844094

اسٹاکسٹ: ادارہ فکر و دانش، الحمد پلازہ، اردو بازار لاہور

ڈاکٹر شہناز مزمل کے تخلیقی آفاق

شبیر ناقدؔ
معرفت پروفیسر ظہور احمد فاتح، نزد تعمیرِ نو اکیڈمی
کالج روڈ، تونسہ شریف ضلع ڈیرہ غازیخان (پنجاب۔ پاکستان)
رابطہ فون: ۰۳۴۲-۵۲۳۷۶۳۶ ۰۳۰۳-۹۲۹۷۱۳۱ ۰۳۳۳-۵۰۶۶۹۶۷

اُردو سخن

استحقاق: تمام تصرفات ''شبیر ناقدؔ'' کی تحویل میں ہیں
ناشر: اردو سخن، پاکستان
نمودِ اول: ۲۰۲۳ء

کمپوزنگ: شہریار ناصر
سرورق: ناصر ملک
طباعت: شیر ربانی پریس، ملتان
قیمت: ۱۰۰۰ روپے (۵۰ یورو، ۵۵ ڈالر)

www.urdusukhan.com

اردو سخن

آرٹ لینڈ، گرلز کالج روڈ، اردو بازار چوک اعظم (لیہ) فون: 0302-7844094

اسٹاکسٹ: ادارہ فکر و دانش، الحمد پلازہ، اردو بازار لاہور

انتساب

شہناز مزمل کے جذبہء خداخوفی
اورانسان دوستی کے نام!

فہرست

باب اول:	شہناز مزمل کا سخن حمد نگاری کے آئینے میں	۷
باب دوم:	شہناز مزمل کا کلام نعت نگاری کے تناظر میں	۱۷
باب سوم:	قرآن پاک کے منظوم مفہوم "نورِ فرقان" کا اجمالی جائزہ	۲۸
باب چہارم:	ڈاکٹر شہناز مزمل کی نظم نگاری	۴۰
باب پنجم:	ڈاکٹر شہناز مزمل کا معرفت آمیز سخن	۶۳
باب ششم:	ڈاکٹر شہناز مزمل کی شاعری اور فکری بیداری	۸۹
باب ہفتم:	ڈاکٹر شہناز مزمل کا نظریہء ادب برائے زندگی	۹۹
باب ہشتم:	ڈاکٹر شہناز مزمل کا سخن عصری بے حسی کے حوالے سے	۱۰۹
باب نہم:	ڈاکٹر شہناز مزمل کی شعری رومانیت	۱۲۱
باب دہم:	ڈاکٹر شہناز مزمل داخلی احساسات کی شاعرہ	۱۳۲
باب یازدہم:	ڈاکٹر شہناز مزمل کی غزل کے فکری موضوعات	۱۳۶
باب دوازدہم:	ڈاکٹر شہناز مزمل کا عمومی طرزِ اظہار	۱۵۴

باب اول

شہناز مزمل کا سخن حمد نگاری کے آئینے میں

ارشادِ خداوندی کے مطابق خدائے بزرگ و برتر نے جنوں اور انسانوں کو اپنی عبادت کے لیے ہی خلق فرمایا۔ عبادات کی مختلف انواع و اقسام ہیں جن میں کچھ مالی ہیں، کچھ بدنی، کچھ عملی اور کچھ نظری نوعیت کی ہیں۔ دیگر عبادات کے پہلو بہ پہلو خالقِ کائنات کی تعریف و توصیف بھی خصوصی اہمیت کی حامل ہے جسے بیک وقت نظری و عملی اعتبار حاصل ہے۔ شذرہ ہذا میں ہم لاہور سے تعلق رکھنے والی معروف شاعرہ شہناز مزمل کی حمد نگاری کے حوالے سے رقم طراز ہیں جن کی ادبی ریاضتوں کی فہرست وسیع ہے جو تین درجن سے زائد تصانیف قارئینِ شعر و ادب کو دے چکی ہیں۔ ہنوز یہ سلسلہ جاری و ساری ہے اور تحقیقی حوالے سے ان کی نسبت سے ہونے والے کام کی نوعیت کچھ یوں ہے۔

۱۔ ڈاکٹر شہناز مزمل شخصیت اور فن۔ سال ۲۰۰۹ء۔ مقالہ نگار صدف رانی۔ مقالہ برائے ایم۔اے (اردو)، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

۲۔ شہناز مزمل کے سفرنامے "دوستی کے سفر" کا تجزیاتی مطالعہ۔ سال ۲۰۱۵ء۔ مقالہ نگار ثناخاور۔ بی ایس (اردو)۔ گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

۳۔ شہناز مزمل کی شاعری کے دینی عناصر۔ ۲۰۱۵ء۔ مقالہ نگار مقدس ستار۔ مقالہ برائے ایم اے (اردو)۔ اورنٹیل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

۴۔ شہناز مزمل کی اردو غزل اور نظم کا فکری و فنی مطالعہ۔ سال ۲۰۱۹ء۔ مقالہ نگار حنا

نعمان۔مقالہ برائے ایم فل (اردو)،منہاج یونیورسٹی لاہور

۵۔ خواتین کی اردو نعتیہ شاعری کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ۔سال ۲۰۲۱ء۔مقالہ نگار رضوانہ بی بی۔مقالہ برائے ایم فل (اردو)۔علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد۔

۶۔ شہناز مزمل کے نعتیہ مجموعہ "رمزِ عشق کا تجزیاتی مطالعہ"۔سال ۲۰۲۱ء۔مقالہ نگار فریحہ وسیم۔مقالہ برائے بی۔ایس (اردو)۔لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی لاہور۔

۷۔ شہناز مزمل کے شعری مجموعہ "قوم کے سائبان" کا فکری وفنی جائزہ۔سال ۲۰۲۱ء۔مقالہ نگار ناہید ارشد۔مقالہ برائے بی ایس (اردو)۔لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی لاہور۔

۸۔ پاکستان میں خواتین کے تراجمِ قرآنی کا علمی جائزہ۔سال ۲۰۲۱ء۔مقالہ نگار مدیحہ عباس۔مقالہ برائے ایم فل (قرآن وتفسیر وعلومِ اسلامیہ)،اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور۔

اس وقت ان کی کلیاتِ حمد ونعت بہ عنوان "انتہائے عشق" مطبوعہ ۲۰۲۰ء ہمارے روبرو ہے جس کی طباعت کا اہتمام اردوسخن پاکستان نے کیا ہے۔کلیاتِ ہذا میں ان کی حمد ونعت کے درج ذیل مجموعہ کلام شامل ہیں۔

۱۔ متاعِ عشق
۲۔ جادۂ عرفاں
۳۔ نورِ کل
۴۔ عشقِ مزمل
۵۔ رمزِ عشق
۶۔ ثنائے عشق

شہناز مزمل کے فکر وفن کا نکتۂ کمال یہ ہے کہ ان کے ہاں حمد ونعت کے تلازمات باہم شیر وشکر ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔فکری حوالے سے عشق ان کا ایک مرکزی تلازمہ ہے جو روحِ

رواں کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصانیف کے ماحول میں لفظ "عشق" کی تکرار واضح طور پر مشاہدہ کی جاسکتی ہے۔

مضمون ہذا میں ہم ان کی مذکورہ کلیات کی اولین کتاب "متاعِ عشق" کا تجزیاتی مطالعہ حمد نگاری کے تناظر میں کریں گے مگر حوالہ جاتی مقاصد کے لیے ان کی کلیات ہی ہمارے پیشِ نظر رہے گی۔ اس ضمن میں ان کے منتخب کلام کو برائے استشہادات واستخراجات پیش کیا جائے گا۔

حمد نگاری ایک مشکل اور بابرکت کام ہے کیونکہ اس سے صحیح معنوں میں عہدہ برآ ہونا ہر کہ مہ کے بس کا روگ نہیں ہے کیونکہ اس میں تھوڑی سی غفلت کے باعث دنیا وعقبیٰ کے اکارت ہونے کا احتمال موجود ہوتا ہے۔ اس لیے یہ عمل نہایت احتیاط کا متقاضی ہوتا ہے۔ یہ سعادت کسی فرخندہ نصیب سخن ور کے حصے میں آئی ہے۔ شہناز مزمل جن میں سے ایک ہیں۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

شہناز مزمل کی حمد گوئی میں اختصاصی زاویوں کی بجائے عمومی زاویے وفور سے پائے جاتے ہیں جسے ان کی فکری رواداری سے عبارت سمجھا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سخن میں سلاست نگاری کا وصفِ خاص پایا جاتا ہے۔ انہوں نے سہل نگاری کی روایت کو تقویت بخشنے کی سعی مشکور کی ہے جس کے علی الرغم ان کا فحوائے بیاں ابلاغیت سے ہم آغوش ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان کی حمد میں ایک فطری رچاؤ ہے جو ہر ذہنی سطح کے قاری سے ہم آہنگ ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان کے حمدیہ کینوس میں داخلی وخارجی اور نفسیاتی وفسلفیانہ امکانات پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ یوں ایک توازن کی فضا برقرار رہتی ہے۔ سخن میں معقولیت ومنطقیت، معروضیت ومقصدیت، جاذبیت اور اپنائیت کے خصائص آشکار ہوتے ہیں۔ یوں ان کا کلام نہ صرف قاری پر اپنی گرفت مضبوط کرتا ہے بلکہ اس کے حواس کو مستعد کرنے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ان کی فکریات فکری بیداری کا ایک معتبر حوالہ ہیں۔ یوں وہ عبد ومعبود کے رشتے کو مضبوط سے مضبوط تر کرتی نظر آتی ہیں۔ ان کے ہاں ایک خود کلامی کا سا انداز پایا جاتا ہے جس کے باعث استفہامیہ انداز میں

جوابی رویے نمو پذیر ہوتے ہیں۔ یوں ان کا حسیاتی ونفسیاتی اور فلسفیانہ گراف بلند ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اسباب وعلل کے نتائج میں شدت احساس اور زورِ بیاں کے تلازمات کو تقویت ملتی ہے۔ ان کے ہاں تصوف کے دو فلسفے، "ہمہ اوست" اور "ہمہ از اوست" کارگر دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی ایک حمد کا مطلع لائقِ توجہ ہے جو بحر رمل مسدس محذوف میں ہے۔ جس کے عروضی ارکان فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن ہیں۔ بحر ہذا ایک رواں دواں مفرد محذوف بحر ہے جو آہنگ وغنائیت میں اہم کردار ادا کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

تو تلاشِ یار میں بھٹکا ہوا
وہ تو اندر ہے ترے اُترا ہوا

("انتہائے عشق" ص ۲۶)

شہناز مزمل کی حمد میں ایک محویت و استغراق کا عالم پایا جاتا ہے اور ان کے ہاں عشقِ خداوندی کے مظاہر موجزن ہیں جنہیں وہ تطہیرِ ذات اور تزکیۂ نفس کے لیے ناگزیر خیال کرتی ہیں۔ وہ اس لمحے کی بڑی شدت سے منتظر ہیں کہ جب خانۂ خدا کی زیارت کی ساعتِ سعید میسر آئے گی اور یہی حاضری ان کے لیے توشۂ مسرت ثابت ہوگی۔ اس تناظر میں ان کی ایک حمد قابلِ ذکر ہے جو بحر ہزج مثمن سالم میں ہے جس کا عروضی وزن مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن ہے۔ لغت میں "ہزج" اچھی آواز اور گانے کی آواز کو کہتے ہیں۔ چونکہ عرب میں اکثر اسی وزن کے اشعار گائے جاتے تھے، اس لیے اس بحر کا نام "ہزج" رکھا گیا۔ بحر ہزج کی اصل مسدس ہے مگر شعرائے فارس وریختہ مثمن بھی استعمال میں لائے ہیں۔ حدائق البلاغہ کے ترجمے میں مولوی صہبائی کا یہ قول کہ اصل میں اس بحر کے آٹھ رکن ہیں، دو رکن کم کر کے مسدس بھی استعمال کرتے ہیں، مسامحت سے خالی نہیں۔ شعرائے عرب اس بحر کو مربع وزن میں بھی استعمال میں لائے ہیں۔

کبھی وہ لمحہ آ ہے گا کبھی وہ بھی گھڑی ہوگی
پھر ہوگا سامنے کعبہ جبیں در پر جھکی ہو گی

ندائیں سن رہی ہوں میں مجھے رب نے پکارا ہے
پہنچ جاؤں گی مکہ میں وہاں پر حاضری ہوگی
جہاں پر اک سمندر نور کا دن رات بہتا ہے
کثافت اس سے دھل جائے گی کامل روشنی ہوگی
کروں گی شکر کیسے میں سخی رحمان آقا کا
عطاؤں سے جزاؤں سے مری جھولی بھری ہوگی
وصالِ عشق بھی شہناز رب کا معجزہ ہو گا
وہ خود جب سامنے ہوگا تو کیسی زندگی ہو گی

("انتہائے عشق" ص:۲۸)

شہناز مزمل کے اظہاری پیمانوں میں ایک ندرت کا پہلو بھی کارفرما ہے۔ وہ فکر کے نئے راستے متعین کرتی ہیں۔ وہ بنی بنائی ڈگر کو بروئے کار نہیں لاتیں۔ ان کی حمد میں نظری پہلو کے پہلو بہ پہلو عملی جہت بھی تندرست و توانا محسوس کی جاسکتی ہے۔ ان کا کلام سوز و گداز کی کیفیت سے مملو ہے۔ جس کے باعث ایک فطری رچاؤ کی فضا واضح طور پر مشاہدہ کی جاسکتی ہے۔ یوں ان کے سخن کے سراپا آمد ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ اگر عروضی حوالے سے بات کی جائے تو انہوں نے زیادہ تر مفرد و مخذوف بحور میں طبع آزمائی کی ہے کیونکہ وہ ان کی غنائیت کی قائل و مائل ہیں۔ یوں ان کے ہاں صوتی، صوری اور سماعتی جمالیات کے شواہد فزوں تر ہو جاتے ہیں۔ ان کی حمد کے درج ذیل اشعار بحر ہزج مربع سالم میں کہے گئے ہیں۔ جس کے عروضی ارکان مفاعیلن، مفاعیلن ہیں۔

بنا کے رکھا زادِ راہ
مسافر نے کی تیاری
ہٹا دے سارے کنکر اب
ذرا کردے گوہر باری

لے آ ئی رنگ آخر کو
یہ میری گریہ و زاری
پہنچ شہنازؔ اس در پر
بیاں کر کیفیت ساری

("انتہائے عشق" ص:۲۹)

ان کی حمدیات میں ایک سرور و مستی کی فضا ہے۔ وہ ہمہ وقت اپنے آپ کو فضائے بطحا میں خیال کرتی ہیں جو ان کی وفورِ الفت کی بین دلیل ہے۔ جسے وہ آگہی سے عبارت سمجھتی ہیں۔ ان کے ہاں حمد و نعت کے تلازمات باہم شیر و شکر ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک حمد و نعت ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ ان کی فکریات میں ایک کرشمہ کاری کا رنگ آشکار ہوتا ہے۔ ان کی ایک حمد جو بحر ہزج مسدس محذوف میں کہی گئی ہے، جس کا عروضی وزن مفاعیلن مفاعیلن فعولن ہے، نذرِ قارئین ہے۔

طوافِ آرزو کرنے لگی ہوں
درِ کعبہ کی جانب چل پڑی ہوں
مرے چاروں طرف اک نور پھیلا
چراغِ عشق روشن دیکھتی ہوں
مرے مرشد مرے صلِّ علیٰ ہیں
انہی کے نقشِ پا پر چل رہی ہوں
حرم ہے سجدہ گاہ میرے نبیؐ کا
شکر الحمد میں بھی آ گئی ہوں
کرشمہ ساز ہے یہ میری چاہت
میں بس شہنازؔ اتنا جانتی ہوں

("انتہائے عشق" ص:۳۰)

ان کی ایک اور حمد ہم بدونِ تبصرہ نذرِ قارئین کرتے ہیں جس کا تجزیہ ہم قارئین کی صوابدید پر چھوڑتے ہیں۔

درِ کعبہ پہ پھر سے آ گئے ہیں
نظر نے جھک کے سجدے کر لئے ہیں
عجب اک روشنی دل میں ہوئی ہے
محبت کے انوکھے مرحلے ہیں
یہاں پر نور کا بہتا سمندر
نہا کر اس میں نوری ہو گئے ہیں
ابھی تو عشق کا نشہ چڑھا ہے
نہ جانے جام کتنے پی لئے ہیں
زباں گنگ ہو گئی الفاظ گم ہیں
بس خالی ہاتھ ہی پھیلا دیئے ہیں
مقدر پہ ہوئی شہنازؔ نازاں
چھپے مخزن سے نذرانے ملے ہیں

("انتہائے عشق" ص:۳۱)

شہنازؔ مزمل کی حمد اسلامی حوالے سے شعورِ حیات سے عبارت ہے جس میں کیف و سرور بھی اور سعادت سامانی بھی ہے۔ طربیہ تاثرات شعریت کی چاشنی کو فزوں تر کر رہے ہیں۔ ان کا فحوائے حمد قرآنی ماخذات سے مملو ہے۔ اسی تناظر میں ان کی حمد کے دو شعر حسبِ ذیل ہیں جو بحر خفیف مسدس سالم مخبون محذوف میں ہیں جس کے عروضی ارکان فاعلاتن مفاعلن فعلن ہیں۔

بندگی کرنا بھی عبادت ہے
کیسی پر کیف یہ سعادت ہے
کب برابر بصیر و نا بینا

اتری یہ آسماں سے آیت ہے

("انتہائے عشق" ص:۳۸)

ان کے حمدیہ کینوس میں جنون و کیف و مستی کی روح پرور فضا ہے۔ اس حوالے سے وہ خمریاتی رموز وعلائم کو بھی بروئے کار لاتی ہیں۔ ان کی حمد نگاری مذہبی ادراکات سے مزین ہے۔ وہ اپنی حمد کے توسط سے بندوں کو خدا سے جوڑنے کا ہنر جانتی ہیں۔ ان کی حمد کے یہ اشعار بحر ہزاج مثمن سالم میں ہیں جس کا عروضی وزن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ہے۔ یہ مفرد ومترنم بحر ہے۔

جنون و کیف و مستی میں ہیں گم سب دیکھ کر کعبہ
نشہ چھایا ہے پی کر مے محبت کی شرابوں کی
ملائک نے سجایا ہے حرم کو کتنی چاہت سے
کرے گا میزبانی رب محمدؐ کے غلاموں کی
بہت ہے جوش میں رحمت بہت ہے خوش مرا اللہ
کرو سجدے کرم مانگو کہ بخشش ہو گناہوں کی

("انتہائے عشق" ص:۵۴)

ان کی حمد تطہیر ذات اور کتھارسز کا ایک معتبر حوالہ ہے جس سے وہ احیائے زیست کا کام لیتی ہیں۔ ان کی حمدیات میں خدائی صفات کا برملا اظہار ملتا ہے۔ ان کے لیے فضائے بطحا وطیبہ سرور سامانی کا باعث ہے جس کا آگہی سے ایک منطقی تعلق ہے۔ وہ عشقِ نبی ﷺ کے اظہار کے لیے بھی حمد کا میڈیم استعمال کرتی ہیں۔ ان کی حمد کے درج ذیل چار اشعار اسی پس منظر کے حامل ہیں جو بحر ہزج مسدس محذوف میں ہیں جن کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن فعولن ہیں۔

عجب سی روشنی دل میں ہوئی ہے
نئی اک زندگی پھر سے ملی ہے
وہی رحمان وہ خالق سمیع ہے

اُسی سے بات ہر دل کی کہی ہے
سکوں مکے مدینے میں ملا ہے
سرور و کیف ہے اک آگہی ہے
قلندر ہوں نہ میں عارف نہ سالک
مرا محور تو بس عشقِ نبیؐ ہے

("انتہائے عشق" ص:۵۵)

وہ حمد کے پیرائے میں مسئلہء جبر بھی زیرِ بحث لائی ہیں۔ یوں تصوف کے فلسفے "ہمہ اوست" کی نمو ہوتی ہے۔ وفورِ محبت و الفت بھی اپنی مثال آپ ہے جو وجہِ ضوفشانی بھی ہے۔ ایک رجائی تاثر ہے جو نور کی تجلی کا مثیل ہے۔ وہ خدائے بزرگ و برتر کو لاثانی و یکتا تصور کرتی ہیں۔ انہی افکار کا اظہار ان کی حمد کے درج ذیل تین اشعار میں کیا گیا ہے جو مذکورہ بالا بحر و وزن میں کہے گئے ہیں۔

ارادہ کچھ نہیں تیرا یا میرا
کہ ہر اک فیصلہ ہے بس اُسی کا
درِ کعبہ کو نظریں چومتی ہیں
تجلی سے دلوں کو نور دے گا
ازل کی زندگی سے تا ابد تک
بتاؤ کون ہے میرے ولی سا

("انتہائے عشق" ص:۵۶)

شہناز مزمل کے فحوائے بیاں میں عشق و محبت کے انمٹ نقوش ملتے ہیں جن کے باعث قلب و خرد کا احیا ممکن ہوتا ہے۔ حمد و نعت کے تلازمات باہم مربوط ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مسئلہ جبر و قدر مشیتِ خداوندی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ان کی حمد کے تین اشعار جو بحر خفیف مسدس مخبون محذوف میں ہیں جن کا عروضی وزن فاعلاتن مفاعلن فعلن ہے، حسبِ ذیل

ہیں۔

جس کی یادوں میں مست رہتی ہوں
میری سوچوں کا بہتا دھارا ہے
روشنی نورِ فیض بس وہ ہی
بگڑی تقدیر کو سنوارا ہے
مجھ کو امید اپنے رب سے ہے
وہ بھی کہہ دے گا یہ ہمارا ہے

("انتہائے عشق" ص: ۶۳)

اگر اسلوبیاتی حوالے سے بات کی جائے تو انہوں نے لسانی اور فکری حوالے سے ہر نوع کی دقیقہ سنجی سے گریز کیا ہے۔ دقیق اور مشکل لفظیات سے شعوری و فطری طور پر کنارہ کشی کر کے قاری کے لیے سہولت کا سامان کیا ہے۔ جمہوری نظریہء تنقید کے اعتبار سے وہ شاعر و ادیب زیادہ لائقِ استحسان ہوتے ہیں جو قاری کی آسانی کو زیادہ مدنظر رکھتے ہیں۔ بعینہٖ یہی معاملہ شہناز مزمل کا بھی ہے۔ عروضی اعتبار سے بھی انہوں نے مفرد و مخذوف بحور کو زیادہ ترجیح دی ہے اور مشکل و سنگلاخ زمینوں سے راہِ اجتناب اختیار کی ہے۔ یوں ان کی حمد آہنگ و غنائیت کی ایک نئی مثال قائم کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔

شہناز مزمل کی حمد نگاری کے فکری و فنی گوشوں کی سیر حاصل غواصی کے بعد یہ حقیقت اظہر من الشّمس ہوتی ہے کہ ان کا ارتقائی سفر تواتر سے جاری و ساری ہے اور انہیں جہانِ فکر و فن میں ریاضتِ بسیار سے مزید مربوط ہونا ہوگا۔ یوں ان کی حمدیات کے تحقیقی و انتقادی امکانات کی باز یافت کا عمل سہل تر ہو جائے گا۔

باب دوم

شہناز مزمل کا کلام نعت نگاری کے تناظر میں

قرآن مجید میں ارشادِ خداوندی ہے" اور ہم نے آپ ﷺ کے ذکر کو بلند کر دیا ہے۔" جس کا ذکر ذاتِ ایزدی بلند کرے، اس کا زبان زدِ عام ہونا قرین فطرت ہے۔ ادب کے تمام شعبوں میں نعت نگاری ایک ایسا شعبہ ہے جس میں غیر مسلم شعراء و شاعرات نے بھی اپنے حصے کا بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ یوں نعت نگاری کی ایک شاندار روایت قائم ہوئی۔ خدا کے فضل و کرم سے شہناز مزمل بھی اسی سلسلے کا حصہ ہیں۔ اس حوالے سے ان کے درج ذیل مجموعہ ہائے نعت منظر عام پر آ چکے ہیں۔

۱۔ جادۂ عرفان
۲۔ نورِ کل
۳۔ عشقِ مزمل
۴۔ رمزِ عشق
۵۔ ثنائے عشق

انہوں نے تمام تر شعری اصناف میں نعت نگاری کی ہے جن میں فرد بھی ہے، قطعہ بھی ہے، غزل بھی ہے اور پابند موضوعاتی نظمیں بھی ہیں۔ اس وقت ان کی کلیاتِ حمد و نعت" انتہائے عشق" مطبوعہ ۲۰۲۰ء ہمارے روبرو ہے۔ شذرہ ہذا میں ہم مذکورہ کلیات میں شامل ان کے نعتیہ مجموعہ "رمزِ عشق" کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس نسبت سے ان کے کلام سے منتخب استشہادات برائے استخراجات لائیں گے اور کوشش کی جائے گی کہ کلی انتقادی تاثر کو اجاگر کیا جائے۔

شہناز مزمل نے دیگر شعری ہیئتوں کے پہلو بہ پہلو گیت کی ہیئت میں بھی نعت گوئی میں طبع آزمائی کی جس سے یہ امر بہ حسن وخوبی آشکار ہوتا ہے کہ وہ کس قدر ہیئتوں کا ادراک رکھتی ہیں۔ انہوں نے فکر وفن کا حسین امتزاج قائم کرنے کی سعی مشکور کی ہے۔ انہوں نے اپنی نعت گوئی کے توسط سے سیرت النبی ﷺ کی ضوفشانی کو نمایاں کرنے کی سعیِ مشکور کی ہے جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئی ہیں۔ انہوں نے حضور نبی اکرم ﷺ کی صفتِ رحمت اللعالمین کے حوالے سے بلیغ انداز میں کام کیا ہے اور اس کی ہمہ گیری کو واضح کیا ہے۔ ان کے نزدیک آپ ﷺ حرم کے تاجدار اور امتوں کے والی ہیں۔ ان کا مکتبِ فکر یہ ہے کہ زندگی کی رونقیں اور رعنائیاں آپ ﷺ کی ذاتِ ستودہ صفات کی بدولت ہیں۔ آپ ﷺ حرم کی شمع اور شاہِ امم ہیں۔ ایک عالم آپ ﷺ کے توسط سے دست بستہ محوِ استدعا ہے۔ ان کی نعت مبارکہ میں ایک استدعائی انداز کارفرما ہے جو دنیا وعقبیٰ کے حوالے سے فلاح وخیر کا ضامن ہے جس کی نسبت ایمان ویقین سے ہے۔ ان کی نعت میں جاذبیت اور اپنائیت کے خصائص پائے جاتے ہیں۔ اس امر میں ان کی نعت کی مقبولیت کا راز پنہاں ہے۔ ان کی درج ذیل نعت جس میں گیت کی ہیئت کو بروئے کار لایا گیا ہے، نعت ہذا بحر متدارک مثمن سالم میں ہے جس کے عروضی ارکان فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن ہیں۔ چونکہ یہ بحر خلیل بن احمد کے بعد اخفش نے نکالی ہے اور خلیل کی بحروں میں مل گئی ہے، اس لیے اس کا نام متدارک رکھا گیا ہے۔ اس کو "رکض الخیل" اور "غریب" بھی کہتے ہیں۔ اس بحر میں خبن، قطع، تسکین اور حذف کے زحاف بکثرت پائے جاتے ہیں۔

ہیں عطا ہی عطا ہیں کرم ہی کرم
تاجدارِ حرم میرے شاہِ اممؐ
زندگی میں ہر اک رنگ ہے آپ سے
آسماں جیسے روشن ہو ماہتاب سے
ہیں عطا ہی عطا اور کرم ہی کرم
آپ شمعِ حرم میرے شاہِ اممؐ

سب سوالی قطاریں بنائے کھڑے
ہیں دعاؤں کے گجروں سے دامن
بھرے
ان کے ایماں و ایقاں کا رکھ لیں بھرم
تاجدارِ حرم میرے شاہِ اممؐ
ان کی دھڑکن درودوں کی مالا بنے
موتی پلکوں پہ ان کی ہیں کتنے سجے
کر دیں ان پہ کرم رکھ لیں ان کا بھرم
تاجدارِ حرم میرے شاہِ اممؐ

("انتہائے عشق" ص: ۳۳۸)

شہناز مزمل کے نعتیہ فکری کینوس میں سماجی ادراکات وفور سے ملتے ہیں اور یہی ان کے کلام کا اعجاز و اختصاص بھی ہے۔ یوں وہ نظریہء ادب برائے زندگی کی علمبردار دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی نعت نگاری ظلمت کی تیرگی کو پاش پاش کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یوں ان کے سخن کا نفسیاتی و حسیاتی اور فلسفیانہ گراف بلند ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان کی شعریات میں طربیہ تاثرات کے پہلو بہ پہلو بہاریہ خصائص بھی بہار سامانی کر رہے ہیں۔ وہ استفہامیہ اشارات کی بدولت شدتِ احساس اور زورِ بیاں کے تلازمات کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ ان کا وفورِ شعر شعریت کی چاشنی کو دوچند کرنے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ انہوں نے نعت نگاری کے تناظر میں غزل کی ہیئت کے متنوع تجربات کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں مردف و غیر مردف اور مسلسل و غیر مسلسل الغرض ہر نوع کے تجربات ملتے ہیں۔ یہی امر ان کے فکر و فن پر دسترس کی مبینہ دلیل ہے جسے نہ جھٹلایا جا سکتا ہے اور نہ فراموش کیا جا سکتا ہے۔ ان کی ایک نعت جو غیر مردف غزل کی ہیئت میں ہے اور مذکورہ بالا بحر و وزن میں کہی گئی ہے، حسبِ ذیل ہے۔

نورِ احمدؐ کی پھیلی ہوئی روشنی

زندگی ، زندگی ، زندگی
مہرِ تاباں کے آنے سے ظلمت گئی
تیرگی بھی کرن بن کے روشن ہوئی
سوکھی ہر شاخ پھر سے ہری ہو گئی
اب خزاؤں میں بھی ہر کلی ہے کھلی
کون آیا یہاں کیسی دنیا سجی؟
چہچہاتے پرندوں نے آواز دی
رقصِ بسمل میں شہناز گم ہو گئی
یہ معطر فضا نغمہ زَن جو ہوئی

("انتہائے عشق" ص:۳۴۰)

سرکارِ مدینہ راحتِ قلب و سینہ ﷺ سے ان کی محبت نہ صرف قابلِ مشاہدہ بلکہ لائقِ ستائش بھی ہے۔ وہ ہر وقت فضائے طیبہ کی خواستگار رہتی ہیں۔ کتابِ مذکور یعنی "رمزِ عشق" جو اس وقت ہمارے زیرِ تجزیہ ہے، کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اس میں شامل تمام تر نعتیہ کلام حضور پرنور ﷺ کے دربارِ اقدس میں ان کے روبرو کہا گیا ہے۔ کتابِ ھذا کے انتخاب کے حوالے سے ہمارے لیے یہ نکتہ اجتہادی حیثیت کا حامل ہے کہ انہوں نے اگرچہ اپنے نعتیہ پیرائیہ ءاظہار کے حوالے سے خمریاتی تلازمات کا استخدام کیا ہے مگر یہ بھی واضح رہے کہ یہ رموز و علائم حقیقی معنوں میں نہیں برتے گئے اور نہ ہی انہیں لغوی اعتبار حاصل ہے۔ بلکہ انہیں مجازی معنوں میں بروئے کار لایا گیا ہے جو تصوف اور عارفانہ اختصاصی منظر سے عبارت ہے۔ ان کے تخیلاتی کینوس میں عمومی اختصاصی زاویے وفور سے ملتے ہیں۔ واضح رہے کہ خمیرات کا متصوفانہ اہتمام شرابِ طہور اور آبِ کوثر کے تناظر میں ہوتا ہے جسے شہناز مزمل بکثرت بروئے کار لائی ہیں۔ ان کی ایک نعت جو بحر متدارک مثمن سالم میں ہے، سپردِ قرطاس ہے۔

آپؐ تھوڑا کرم مجھ پہ فرمایئے

در پہ بلوایئے ، در پہ بلوایئے
عشق پیالہ مرا خالی ہونے نہ دیں
تشنہ لب عشق کو جام پلوایئے
کالی کملی کی ہی دیکھ لوں اک جھلک
خواب ہی میں مرے آپ آجایئے
بانٹوں گجرے سلاموں کے آکر وہاں
اب درودوں کی مالا بھی پہنایئے
منتظر ہے سماعت یہ سننے کو اب
حاضری تیری شہنؔاز اب چاہیئے

("انتہائے عشق" ص:۳۴۱)

ان کی ایک اور نعت ہم بدونِ تجزیہ نذرِ قارئین کرتے ہیں جس کا تبصرہ ہم قارئین کی صوابدید پر چھوڑتے ہیں۔ دیدہ باید کہ وہ اس حوالے سے کیا رائے قائم کرتے ہیں۔

بے قراری مری اور بڑھنے لگی
ورد صلِّ علیٰ کا میں کرنے لگی
درد لذت بنا کیف چھانے لگا
سیڑھیاں عشق کی پھر سے چڑھنے لگی
میری پلکوں پہ موتی چمکنے لگے
اپنی چنری میں ان کو میں بھرنے لگی
مصطفیٰ ﷺ، مصطفیٰ ﷺ، مصطفیٰ ﷺ، مصطفیٰ ﷺ
اسمِ اعظم محبت سے پڑھنے لگی
پھر سکوں مل گیا دل کو چین آ گیا
نور رستے پہ شہنؔاز چلنے لگی

("انتہائے عشق" ص: ۳۴۴)

شہناز مزمل فکری اعتبار سے قناعت پسند طبیعت کی مالک ہیں۔ قدرت نے انہیں توکل و استغنا اور ایثار و مروت جیسی صفاتِ جمیلہ ودیعت کی ہیں۔ اس لیے وہ ہر حال میں صابر و شاکر اور قانع رہتی ہیں۔ یہی امران کی مستقل مزاجی کا عکاس بھی ہے۔ وہ طرفدارِ خرد ہونے کی بجائے علمبردارِ جنوں بھی ہیں، عشق ان کے کلام کا مرکزی و معتبر حوالہ ہے۔ تمام برکات و فیوض انہیں عشقِ نبوی ﷺ کا ثمرہ محسوس ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں عشق کے حوالے سے ایک محویت و استغراق کا عالم پایا جاتا ہے۔ ایک سرخوشی و سرمستی ہے جو خود سپردگی کی ردا اوڑھے ہوئے ہے۔ وہ اپنے مقدر کی تابناکی عشقِ مصطفوی ﷺ سے مربوط سمجھتی ہیں۔ وہ آپ ﷺ کو اپنا راہبر و ہادی تصور کرتی ہیں۔ اسی پس منظر میں ان کی ایک نعت قابلِ ذکر ہے جو غزل کی غیر مردف ہیئت میں ہے اور بحر متدارک مثمن سالم میں کہی گئی ہے۔ انہوں نے اپنی نعت گوئی میں اس بحر و وزن کو بکثرت برتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ ان کی ایک پسندیدہ بحر ہے۔ جس کے عروضی تقاضے نبھانا ان کے لیے چنداں دشوار نہیں ہیں۔ گویا یہ بحر و وزن ان کے طبعی میلان کا حصہ بھی ہو سکتے ہیں۔

شکر الحمد میں ڈوبی ہوں سر بسر
پھر سے تقدیر لائی ہے ان کے نگر
مجھ کو جاں سے بھی پیارے ہیں صلِّ علی
عشق کا مجھ کو میرے ملا ہے ثمر
نور کے جھٹپٹے میں اچانک دکھا
جھلملاتا ہوا میرے آقا کا در
میں تو مدہوش عشقِ مُزمل میں تھی
سامنے ان کو پایا اٹھی جو نظر
کوئی تقدیر میری بدل نہ سکا
خاک کو کر دیا مصطفیٰ ؐ نے گہر

کھو ہی جاتی یہ شہنازؔ رنگینی میں
گر نہ بنتے مُزَّمِلؐ مرے راہبر

("انتہائے عشق" ص:۳۴۵)

حضور نبی اکرم ﷺ کے اقوال و افعال آپ ﷺ کی ذات ستودہ صفات اور آپ ﷺ کے اسوۂ کامل کی بلیغ جھلکیاں شہنازؔ مزمل کی نعت میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ آپ ﷺ کی اپنی امت سے بے پایاں محبت بھی ان کی نعت کے نمایاں خدوخال میں شامل ہے۔ جن میں شفاعت کا وعدہ بھی شامل ہے اور حمایتِ ایزدی کو حمایتِ نبوی سے موسوم کیا گیا ہے۔ مذکورہ بالا بحر و وزن میں کہی گئی ان کی ایک نعت کے پانچ اشعار جو غزل کی غیر مردف ہیئت میں ہیں، لائقِ ذکر ہیں۔

اُمّتی ، اُمّتی ، اُمّتی ، اُمّتی
وقت نزع زباں پر یہی بات تھی
رات بھر رو کے سجدوں میں کی التجا
کہہ دے اُمت مری تو نے ہے بخش دی
رب نے مخصوص لوگوں کو تھا چن لیا
جن سے نوری محمدؐ کی امت بنی
آپؐ نے ہے شفاعت کا وعدہ کیا
روزِ محشر گواہی بھی دیں گے وہی
مومنو! یہ بشارت ہے سب کے لئے
رب ہے ان کا ولی جن کے ہیں یہ نبیؐ

("انتہائے عشق" ص:۳۴۶)

شہنازؔ مزمل کی نعت کے فحوائے بیاں میں کہیں عمومی طور پر وفورِ محبت و عقیدت کا پہلو ہے تو کہیں کہیں قرآنی ماخذات و ادراکات کی ضوفشانی ہے۔ کہیں درود و سلام کی کیفیت ہے تو

کہیں شوقِ دیدار کے تذکرے ہیں۔ کہیں عشقِ فراواں کی کیفیت ہے تو کہیں فضائے طیبہ کو خلدِ بریں کے مماثل قرار دیا جا رہا ہے۔ وسیع تر تشبیہاتی اعماق و آفاق ہیں جو شعریت کی چاشنی کو فزوں تر کر رہے ہیں۔ کہیں کیف و وجدان کے حوالے ہیں تو کہیں نور کے ہالے ہیں۔ خشوع و خضوع کا وہ عالم ہے جو وجد آور نوعیت کا غماز ہے۔ بحر متدارک مثمن سالم میں کہی گئی ان کی یہ نعت انہی تاثرات و تاثیرات کی حامل ہے۔

پائی تسکین عشقِ فراواں نے تھی
سجدہ کرنے کو خُلدِ بریں مل گئی
شوقِ دیدار پورا مرا ہو گیا
جالیوں پہ نظر میری جیسے پڑی
میری نظروں میں دل میں وہی تھے بسے
آئینہ خانہ دل کی یہ نگری بنی
کملی کھوسی گئی کیف و وجدان میں
ورد صلِّ علیٰ کا ہی کرتی رہی
کیف آور تھی شہناز کی وہ نماز
سجدے سے سر کو اپنے اٹھا نہ سکی

("انتہائے عشق" ص: ۳۴۷)

ان کی نعت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے ماقبل کی مکمل تاریخ ایک اجمالی انداز میں سمٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے ہاں ایجاز و اختصار بھی ہے اور فصاحت و بلاغت بھی ہے۔ گویا بیان کے وسیع تر امکانات پائے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی نعت میں تخلیقِ کائنات کے اسرار و رموز بھی پنہاں ہیں۔ ان کی نعت گوئی میں واقعیت پسندی بھی ہے اور حقیقت نگاری بھی ہے۔ ان کی نعت مبالغہ اور غلو جیسی آلائشوں سے مبرا و ماورا ہے۔ ان کے ہاں اخلاص کی شدت بھی ہے اور مروت کی فراوانی بھی ہے۔ ان کا پیرائیہء اظہار فطری رچاؤ کا حامل ہے۔ یوں ان کا کلام سراپا آمد اور

قرینِ فطرت معلوم ہوتا ہے۔ تصنع اور تکلف ان سے گریزاں ہیں۔ فکری وفنی اور لسانی الغرض ہر نوع کی دقیقہ سنجی سے شعوری طور پر گریز کی راہ اختیار کرتی ہیں۔ لسانی حوالے سے ان کے ہاں عربی وفارسی الفاظ بکثرت ملتے ہیں۔ البتہ کہیں کہیں ہندی بھاشا کی سندرتا اور کوملتا کا مشاہدہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ ان کے ہاں معروضیت ومعقولیت اور منطقیت و استدلالیت کے خصائص نمایاں ہیں جو ان کے تخلیقی آفاق واعماق کی ضمانت بھی ہیں۔ غیر مردف غزل کی ہیئت میں کہی گئی ان کی ایک نعت جو بحر متدارک مثمن سالم میں ہے، زیبِ قرطاس ہے۔

آپؐ کے دم سے روشن چراغِ جہاں
ظلمتوں میں تھی گم ساری خلقت یہاں
رب نے آویزاں لوح وقلم جب کیا
اس نے لکھا تھا اسمِ محمدؐ وہاں
کیا محبت ہے عاشق کی معشوق سے
ان کی خاطر بنائے زمیں آسماں
عرش پر تھا ملائک نے سجدہ کیا
لیکن ابلیس انسان سے بدگماں
ہے ابد سے ازل تک کا یہ سلسلہ
یونہی چلتا رہے گا سدا کارواں
لب پہ شہنازؔ کے رہتی ہر پل دعا
ساتھ ہوں اپنے وارثِ کون ومکاں

("انتہائے عشق" ص:۳۵۰)

شہنازؔ مزمل کی نعتیہ ریاضت سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ان کے ہاں کس قدر وفورِ عقیدت ومحبت ہے۔ جس سے اس امر کی عکاسی ہوتی ہے کہ وہ دائیں بازو کے حلقۂ ادب سے تعلق رکھنے والی ایک راسخ العقیدہ مسلمان شاعرہ ہیں۔ ان کے ہاں نظری وعملی پہلو تقویت کے

حامل ہیں اور مذہب وملت ان کی اولیں ترجیح ہے۔ بدعت نما جدت سے ان کا دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ ان کا کلام کلاسیکی اقدار کا حامل ہے۔ ان کی نعت میں اسلامی تصورات و خدوخال نمایاں ہیں۔ عاجزی وانکساری ان کی فکر کا طرۂ امتیاز ہے اور یہی ان کے سخن کا اعزاز ہے۔ ان کی ایک نعت جو بحر متقارب مثمن سالم میں کہی گئی ہے، جس کے عروضی ارکان فعولن فعولن فعولن فعولن ہیں، ملاحظہ فرمائیں۔ واضح رہے کہ یہ بحر مثمن سالم مستعمل ہے۔ تقارب اور متقارب اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں وتد اور سبب نزدیک نزدیک ہیں کیونکہ لغت میں تقارب تفاعل کے وزن پر باہم نزدیک ہونے کے معنی میں ہے۔ یہ اہلِ عرب کی پسندیدہ بحر ہے جسے الطاف حسین حالی اور دیگر شعرائے اردو نے بکثرت برتا ہے۔ مسدس حالی بھی اسی بحر ووزن میں ہے۔ عروض وضرب اس بحر کے سالم یا مقصور یا محذوف ہر طرح مستعمل ہیں۔ اس بحر کو شعرائے فارسی نے بھی بہت استعمال کیا ہے۔ اردو شعرا بھی اس کو پسند کرتے ہیں۔

مجھے پھر سے آقا مدینے بلا لیں
اسے آئینہ خانہ پھر سے بنا دیں
پھروں گی میں طیبہ میں صحنِ حرم میں
مجھے شاہا گنبدِ خضرٰی دکھا دیں
بنا لائی ہوں میں سلاموں کے گجرے
درودوں کی مالا جو گنیا کو لادیں
مرے عشق کی کوئی حد ہی نہیں ہے
مجھے کیف ومستی کی دنیا دکھا دیں
چلی آئی شہناز کشکول تھامے
درِ مصطفیٰ ؐ کا گداگر بنا دیں

("انتہائے عشق" ص:۳۵۱)

ان کے نعتیہ اظہار میں رواداری اور بے تکلفی وفورِ عقیدت والفت کی علامت ہیں۔ مگر ان

کے نزدیک احتیاط مقدم ہے کیونکہ تھوڑی سی بے احتیاطی توشہء دنیا وعقبیٰ کو اکارت کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شمار اہلِ احتیاط میں ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے ہاں مجاز ومعرفت کی حدود وقیود سمٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں مگر ایک خطِ تخصیص اور حدِ مغائرت ضرور قائم ہے۔ البتہ وہ اپنے اظہار کو وسعت ضرور دیتی ہیں۔ غیر مردف غزل کی ہیئت میں کہی گئی ان کی ایک نعت لائقِ التفات ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں ہر نوع کے فنی تجربات موجود ہیں۔ نعت ہذا بحر متدارک مثمن سالم میں کہی گئی ہے۔

تو نہاں ہو ذرا ڈھونڈتی میں پھروں
ہو اگر روبرو تجھ کو دیکھا کروں
جانے کیوں ہر گھڑی ہے تری آرزو؟
چین عاشق کو لینے نہ دیتا جنوں
میری سانسوں میں دھڑکن میں بس تُو ہی تُو
اس لیے ہرگھڑی باوضو مَیں رہوں
عشق کے دائرے میں ہی محصور رکھ
جیسا تُو چاہتا ہے میں ویسی بنوں
اب تو شہنازؔ کی ہے یہی جستجو
دوریاں ختم ہوں پاس تیرے رہوں

("انتہائے عشق" ص:۳۵۲)

مذکورہ بالا استشہادات واستخراجات اس امر کی مبینہ دلیل ہیں کہ شہنازؔ مزمل کی نعت میں وہ تمام خصوصیات شامل ہیں جو ایک صحت مند نعتیہ روایت کا حصہ ہیں جس میں فکر وفن کے جملہ تلازمات کو ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے۔ اگر نعت گوئی کے حوالے سے ان کی ریاضت اسی تسلسل سے برقرار رہی تو وہ نعت نگاری کا ایک مستقل حوالہ قرار پائیں گی اور ان کا یہی عظیم کارنامہ ان کے لیے توشہء آخرت ثابت ہوگا۔

باب سوم

قرآن پاک کے منظوم مفہوم "نورِ فرقان" کا اجمالی جائزہ

خالقِ ارض وسما نے اس انگارۂ خاکی کو متنوع خصوصیات سے متصف فرمایا اور یہی اوصاف اس کی پہچان قرار پائے۔ حضرتِ انسان کو اشرف المخلوقات کے شرف سے اس لیے مشرف کیا گیا کیونکہ اسے صفاتِ ایزدی میں سے جزوی حصہ میسر آیا ہے۔ جسے اس کا اعزاز وافتخار گردانا جا سکتا ہے۔ تمام تر خصوصیات میں سے نطق و بیان کی خصوصیت کو امتیازی حیثیت حاصل ہے اور یہی وصفِ خاص ہی علم وادب کے عمل کو جادۂ ارتقا پر گامزن کرتا ہے۔ اگر تحقیقی وتنقیدی تناظر میں بات کی جائے تو ہر اہلِ قلم کو مشیت کی طرف سے کچھ مخصوص اوصاف ودیعت کیے جاتے ہیں۔ وہ قلم کار فرخندہ نصیب ہوتے ہیں جو ہمہ جہت اور ہمہ گیر نوعیت کے حامل ہوتے ہیں۔ شہناز مزمل کا تعلق بھی اسی حزب القلم سے ہے جن کی منثور ومنظوم تصانیف کا تعدد تین درجن سے بھی متجاوز ہے۔ ان کے تمام تر علمی وادبی کارناموں میں قرآن مجید فرقانِ حمید کے منظوم مفہوم کو امتیازی مقام ومرتبہ حاسل ہے جسے انہوں نے "نورِ فرقان" سے موسوم کیا ہے۔ جس کی طباعت ۲۰۲۰ء میں عمل میں آئی۔ یہ اتنا عظیم کام ہے جس کی سعادت بہ ہی کم سخنوروں کو میسر آئی ہے۔ انہیں انگلیوں پر بہ آسانی گنا جا سکتا ہے۔ طبقہء اناث میں شہناز مزمل کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

قارئین کی سہولت کے لیے یہ صراحت ناگزیر ہے کہ قرآن مجید کے منظوم مفہوم اور منظوم ترجمے میں ایک حدِ مغائرت ہے۔ ایک خطِ تخصیص ہے۔ یعنی دونوں کا معاملہ الگ الگ ہے۔ منظوم ترجمے کو صرف لغوی اعتبار حاصل ہوتا ہے جس میں کمی بیشی کی قطعاً گنجائش نہیں ہوتی جبکہ

منظوم مفہوم تفسیر تو نہیں ہوتا البتہ منظوم ترجمے کی نسبت سے تفسیر کے زیادہ قریب تر ہوتا ہے جو وسعت کا حامل بھی ہوسکتا ہے۔ البتہ یہ امر مصدقہ ہے کہ منظوم ترجمہ منظوم مفہوم کی نسبت احتیاط کا زیادہ متقاضی ہوتا ہے جس میں کسی نوع کی افراط وتفریط کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔

"نورِ فرقان" کے اجمالی جائزے کے عمل سے قبل حدیثِ دیگراں کی جانکاری بھی انتہائی ضروری ہے۔ تاکہ اجتماعی تاثر کو اجاگر کیا جاسکے۔ جس کی تفصیلات میں یہ امر مبادی ہے کہ اس کے تاثرات نگاروں میں کون کون شامل ہیں اور ان کے اس حوالے سے کیا کیا تاثرات ہیں۔ اولاً تاثرات نگاروں کے اسمائے گرامی کا مذکور ہوگا بعدازیں منتخب تاثرات نگاروں کے تاثراتِ منتخبہ نذرِ قارئین کیے جائیں گے۔ تاثرات نگاروں کے نام حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔	مفتی حافظ امیر علی صابری	۲۔	پروفیسر ڈاکٹر فرخندہ منظور
۳۔	پروفیسر ڈاکٹر محسنہ منیر	۴۔	ڈاکٹر فوزیہ فیاض
۵۔	ڈاکٹر رضیہ اسماعیل	۶۔	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی
۷۔	پروفیسر میمونہ مرتضیٰ ملک	۸۔	پروفیسر محمد حسین شاہین بھٹی
۹۔	عبدالحق عارف	۱۰۔	صاحبزادہ میاں اشرف عاصمی
۱۱۔	ثوبیہ خان نیازی	۱۲۔	میاں وقار الاسلام
۱۳۔	تسنیم عاجزہ	۱۴۔	عاصمہ احمد
۱۵۔	شبانہ احمد		

اب منتخب تاثرات نگاروں کی آرا درج ذیل ہیں۔

"محترمہ شہناز مزمل ایک علمی و ادبی شخصیت ہیں۔ تین درجن سے زائد کتب کی مصنفہ ہیں۔ شعر وسخن میں بھی ایک خاص مقام حاصل ہے۔ علاوہ ازیں روحانیت سے دلی لگاؤ ہے اور تصوف کو سرمایہء حیات سمجھتی ہیں۔ مزید برآں انہوں نے قرآن مجید کا منظوم مفہوم ترجمہ کر کے خواتین شعرا کے لیے ایک مثال قائم کردی ہے اور انہیں دعوت دی ہے کہ وہ بھی

اس میدان میں آگے بڑھیں اور قرآن مجید کے زیرِ سایہ روحانیت اور تصوف کی روشنی سے اذہان وقلوب کو منور کریں۔قرآن پاک کا مفہوم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے تصحیح وتصدیق کے لیے یہ ذمہ داری مجھ پر ڈالی تاکہ اگر کسی قسم کی لفظی ، معنوی اور مفہومی غلطی ہو تو اس کی اصلاح ہو جائے۔ میں نے فی الحال سرسری طور پر اس کو دیکھا اور متاثر ہوا۔ یقیناً یہ ایک بڑی فضیلت کا کام ہے۔مولا کریم ہمیں مل کر اس کام کو پایہء تکمیل تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے کیونکہ

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ"

(مفتی حافظ امیر علی صابری، جامعہ نعیمہ گڑھی شاہولا ہور ص:۹)

"ڈاکٹر صاحبہ کی ایک عظیم ادبی کاوش قرآن پاک کا منظوم مفہوم تحریر کرنا ہے۔ انہوں نے بڑے شوق،لگن اور احترام سے اس کام کو انجام دیا ہے۔ وہ مجھ سے اس بات کا تقاضا کرتی تھیں کہ میں اس منظوم مفہوم کے شائع ہونے سے پہلے اپنی یونیورسٹی کے شعبہ اسلامک سٹڈیز کے اساتذہ سے اس کی اصلاح کرادوں تاکہ وہ اطمینان سے اسے شائع کرالیں۔ میں نے اس سلسلے میں ان کی مدد کی جس کے ساتھ ہی انہوں نے پراعتماد طریقے سے اپنا کام مکمل کرلیا۔ مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر صاحبہ اس شاہکار کو شائع کروا کر قارئین تک پہنچا رہی ہیں۔ میں دینی وادبی میدان میں ان کی مزید کامیابیوں اور بلندیوں کے لیے دعا گو ہوں۔"

(پروفیسر ڈاکٹر فرخندہ منظور، چیئر پرسن شعبہ زوالوجی،سابق وائس چانسلر،لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی لاہور،ص:۹)

"ڈاکٹر شہناز مزمل نے قرآن مجید کا مکمل ترجمہ قرآن پاک کا منظوم مفہوم

کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس لحاظ سے شاید وہ پہلی خاتون ہیں جنہوں نے اردو زبان میں قرآن مجید کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ انہوں نے اس کام کا آغاز ۲۰۱۲ء میں سعودی عرب میں عمرہ کی ادائیگی کے بعد کیا تھا اور ۲۰۱۴ء میں یہ پایہ تکمیل کو پہنچا۔ تیسویں پارے کا منظوم ترجمہ جنوری ۲۰۱۷ء میں ادب سرائے پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا ہے۔ باقی حصے طباعت کے مراحل میں ہیں۔ موصوفہ نے اپنے ترجمہ کے بارے میں لکھا ہے۔ "یہ ترجمہ نہیں ہے اور نہ میں اس کی اہل ہوں۔ بس منظوم مفہوم ہے، اسے میری ایک عاجزانہ کاوش کہہ سکتے ہیں۔" اس کی اشاعت تک الحمدللہ ان کی کلیات سمیت ۴۰ کتب شائع ہوگئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ موصوفہ کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔"

(ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، ص: ۱۵)

"ڈاکٹر شہناز مزمل انہی چند مخصوص لوگوں میں سے ایک ہیں۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے انہیں علم و ادب اور دین کی خاص فہم عطا فرمائی ہے۔ زیرِ نظر منظوم ترجمہ ایک شاہکار ہے۔ یقیناً ان کی آخرت کی فلاح بھی اس میں پوشیدہ ہے۔ میں اپنے لیے باعث تعرف و کرامت تصور کرتی ہوں۔ اس عزت رتبہ کے گو کہ میں خود کو ہرگز قابل نہیں پاتی ہوں لیکن ڈاکٹر صاحبہ کی محبت و شفقت نے مجھے آج باعزت اور قدآور بنا دیا ہے۔ محترمہ سے سعودی عرب میں اکثر ادبی و مذہبی نشست انفرادی و اجتماعی رہی اور مجھے آپ سے استفادہ کا خاطر خواہ موقع بھی ملا۔ آپ کی علمی قدردانی تو رب العزت کے پاس محفوظ ہے، لیکن بحیثیت ایک طالبہ کے میں خود ان سے ان کے ادبی ذوق اور دینی لگاوٹ سے متاثر ہوئی ہوں۔"

(پروفیسر میمونہ مرتضیٰ ملک)

"اتنا بڑا ،اہم اور نازک کام کرتے ہوئے شعری قواعد اور کتابت میں پروف ریڈنگ نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ اس کام کے لیے خاکسار کا انتخاب میرے لیے بہت بڑا اعزاز اور مقامِ تشکر ہے۔ تین چار ماہ کی ریاضت سے ایک ایک لفظ پڑھا۔ خواہرِ محترم سے گزشتہ پچیس سالوں سے کچھ نہ کچھ سیکھتے رہتے ہیں۔ شاید اس لیے انہوں نے خصوصی اجازت مرحمت فرمائی۔ بعض جگہوں پر نامانوس بحور اور کئی ایک جگہ مفہوم کی وسعت کو سمیٹنے کی کوشش نے روانیٔ کلام کو متاثر کیا ہے۔ تاہم مجموعی طور پر یہ کہنا بجا ہے کہ انہوں نے پیغام کی صحیح روح قارئین تک آسان، عام فہم اور موثر انداز میں منتقل کرنے کی نہایت کامران سعیِ جلیلہ کی ہے۔ اظہارِ علمیت کے لیے دقیق الفاظ ومحاورات، روزمرہ اور دیگر صنائع بدائع کے استعمال سے ارادۃً اغماض برتا ہے۔ بھرپور کوشش کی ہے کہ سادہ، موثر اور درست تاثر قارئین تک پہنچے۔"

(پروفیسر محمد حسین شاہین بھٹی، صدر شعبہ اردو، ڈی ایس سکول اینڈ انٹر کالج، ماڈل ٹاؤن، لاہور، ص:۱۶)

"نورِ فرقان، قرآن پاک کا منظوم مفہوم ڈاکٹر شہناز مزمل کی انتہائی منفرد کاوش ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے قرآن مجید کو آسان شعری طرز پر بیان کیا ہے۔ اس طرح کا کام عصرِ حاضر میں کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ کچھ سال پہلے جب ڈاکٹر شہناز مزمل کی طبیعت کچھ ناساز رہنا شروع ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ آپ اپنی انرجی سیو کیا کریں۔ ادبی کام اور ادبی پروگرام میں شرکت کو تھوڑا مختصر کریں۔ مزید یہ کہ اپنی شاعری کو کلیات کی شکل میں لائیں اور اس کو مکمل کریں۔ بجائے نئی کتاب لکھنے کے، کیونکہ انہوں نے جو کام کیا تھا، وہی بہت زیادہ تھا اور اسے

دوبارہ مرتب کرنے کے لیے بھی خاص انرجی درکار تھی۔ مگر شاید ڈاکٹر شہناز مزمل ایک ایسی شخصیت ہیں جنہیں روکنا ناممکن ہے۔ شوگر اور بلڈ پریشر کی وقتاً فوقتاً شکایات کے باوجود بھی انہوں نے خاموشی سے اور لگن سے اپنا کام جاری رکھا اور ایک بہترین تخلیق ایک بہترین فن پارے کو منظرِعام پر لانے میں کامیاب بھی ہوگئیں۔"

(میاں وقار الاسلام، ص: ۲۰-۲۱)

مذکورہ بالا تمام تاثرات نگاروں نے اپنی علمی و ادبی اور فکری و فنی بساط کے مطابق حتی المقدور شہناز مزمل کے فکر و فن کے کسی نہ کسی گوشے کو آشکار کرنے کی سعی بلیغ کی ہے اور وہ اس حوالے سے کسی نہ کسی حد تک کامیاب و کامران بھی ہوئے ہیں۔ اب ہم استشہادات کے طور پر "نورِ فرقان" میں سے کچھ منتخب حصص نذرِ قارئین کریں گے اور انہی استشہادات سے تحقیقی و انتقادی حوالے سے کچھ استخراجات بھی اخذ کریں گے تاکہ قارئین اور محققین و ناقدین ان کے اس عظیم کارنامے کی تحقیقی و انتقادی اہمیت سے آشنا ہوسکیں۔ ہماری کوشش رہے گی کہ تجزیاتی حوالے ایک مجموعی تاثر کو اجاگر کریں اور تمام تر تناظرات کو موضوعِ بحث بنائیں تاکہ کوئی بھی پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔

ڈاکٹر شہناز مزمل نے قرآن مجید کے منظوم مفہوم "نورِ فرقان" کے لیے پابند شاعری کا انتخاب کیا ہے جو ایک انتہائی مشکل کام ہے۔ کیونکہ اس میں فزوں تر فنی تقاضے حائل ہوتے ہیں جن میں قوافی اور ردیفیں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں عروضی مسائل کا الگ سامنا کرنا پڑتا ہے مگر وہ عزمِ صمیم کی مالک ہیں اور انہوں نے اسے پابند شاعری میں ہی پایہء تکمیل کو پہنچایا ہے۔ اگر وہ اس سلسلے میں آزاد نظم کو بروئے کار لاتیں تو ان کے لیے افراط و تفریط کی آلائشوں سے محفوظ و مامون رہنا قدرے آسان ہوتا۔ یہ کمی بیشی لسانی حوالے سے بھی ہوسکتی ہے، فکری حوالے سے بھی ہوسکتی ہے اور عروضی تناظر میں بھی ہوسکتی ہے۔ انہوں نے اس کے لیے کلاسیکی شعری ہیئت مثنوی کا انتخاب کیا ہے جو قدیم قصے کہانیوں اور داستانوں کو منظوم کرنے کے لیے مستعمل رہی ہے۔ جو ہیئتی اعتبار سے ان کے لیے زیادہ موزوں بھی رہی ہے۔ اصطلاح میں ان اشعار کو مثنوی کہتے ہیں جن میں دو

مصرع باہم مقفیٰ ہوں۔شعرائے اردو میں میر تقی میر اور میر حسن اپنے اپنے وقت میں مثنوی لکھنے میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔اس فن میں انہیں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔باقی شعرا انہی کے مقلد ہیں۔ حکیم مومن خان مومن نے بھی مثنوی کے فن کو بامِ عروج پر پہنچایا۔

شہناز مزمل نے مثنوی کی ہیئت کے حوالے سے مختلف النوع کے فنی تجربات کیے ہیں۔"نورِ فرقان" میں انہوں نے مردف اشعار کی صورت میں بھی قرآن مجید کے منظوم مفہوم کو پیش کیا ہے اور غیر مردف اشعار کی صورت میں بھی کامیاب کوشش کی ہے۔اگر قوافی کے حوالے سے بات کی جائے تو انہوں نے ہر نوع کے قوافی کا عمدہ استخدام کیا ہے جن میں آزاد قوافی بھی ہیں اور صوتی قوافی بھی ہیں۔علاوہ ازیں مکمل پابند قوافی بھی ہیں۔انہوں نے مشکل اور آسان ہر قسم کے قوافی کا اہتمام بہ حسن وخوبی کیا ہے۔امرِ ہذا بھی ان کی فن پر دسترس کی دلیل ہے۔انہوں نے وہ مثنوی کے مقرر کردہ اوزان وبحور کے علاوہ بھی دیگر اوزان میں طبع آزمائی کی ہے۔

مثنوی کی مقرر کردہ بحور واوزان حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔بحر متقارب مثمن محذوف الآخر، یا مقصورا لآخر۔

عروضی ارکان:فعولن فعولن فعولن فعل یا فعول

۲۔ بحر ہزج مسدس محذوف الآخر یا مقصورا لآخر

عروضی ارکان:مفاعیلن مفاعیلن فعولن یا مفاعیل۔

۳۔ بحر ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف الآخر یا مقصورا لآخر

عروضی ارکان:مفعول مفاعلن فعولن یا مفاعیل

۴۔ بحر خفیف مسدس مخبون محذوف الآخر یا مقصورا لآخر

عروضی ارکان:فاعلاتن فاعلاتن فاعلن یا فاعلان

۵۔ بحر رمل مسدس مخبون محذوف الآخر یا مقصورا لآخر

عروضی ارکان:فاعلاتن فاعلاتن فعلن یا فعلان

۶۔ بحر رمل مسدس مخبون محذوف الآخر یا مقصورا لآخر

فعلاتن فعلاتن فعلن یا فعلان

۷۔ بحرِ سریع مسدس مخذوف الآخر یا مقصور الآخر

عروضی ارکان: مفتعلن مفتعلن فاعلن یا فاعلان

عصرِ حاضر میں چونکہ مثنوی کا رجحان کم ہوتا جا رہا ہے، اس لیے بحور و اوزان کی یہ تخصیص روا نہیں رہی۔ معاصر شعرا کسی بھی بحر یا وزن میں مثنوی پر طبع آزمائی کرنے میں آزاد ہیں۔

شہناز مزمل نے اپنے قرآن مجید کے منظوم مفہوم "نورِ فرقان" میں معروضیت پر عمل پیرا ہونے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔ حتی المقدور انہوں نے افراط و تفریط کی آلائشوں سے راہِ گریز اختیار کرنے کی سعیِ مندوب کی ہے اور قرآن مجید کے مفہوم کو ہو بہو پیش کرنے کی سعی مشکور کی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے سادہ و سلیس اسلوب اختیار کیا ہے اور مدعا نگاری کا حسین قرینہ نبھایا ہے۔ یوں سہل نگاری کی روایت کو تقویت پہنچانے کی سعیِ جمیل کی ہے اور قارئین پر قرآن فہمی کے ابواب وا کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ پارہ نمبر ۱ سورۃ البقرۃ کی چند آیات کا منظوم مفہوم نذرِ قارئین ہے جو بحر متقارب مثمن مخذوف الآخر میں ہے۔ جس کا عروضی وزن فعولن فعولن فعولن فعل ہے۔ یہ وزن مثنوی کے مقرر کردہ اوزان میں سے ہے۔

سنو کان دل پہ ہے تالا لگا
کہ آنکھوں پہ بھی ان کی پردہ پڑا
ملے گا انہیں بس عذابِ عظیم
نہ بخشے گا اُن کو خدائے کریم

وہ کہتے ہیں ایمان لائے ہیں ہم
وہ دانش ہماری سمجھتے ہیں کم
سمجھتے ہیں دھوکا دیے جائیں گے
مگر خود سے دھوکہ وہ کھا جائیں گے
خرابی میں اُن کو چلایا گیا

دلوں میں بہت جھوٹ پایا گیا
کہا تم زمیں میں کرو مت فساد
نہ پیدا کرو دل میں اپنے عناد
صلاح ان کو ایمان کی جب بھی دی
تو کہتے ہیں کب پاگلوں کی سنی
وہ پاگل ہیں خود پر وہ جانیں کہاں
مگر بات ایماں کی مانیں کہاں

(ص:۲۹)

شہناز مزمل قرآنی مفہوم کا مکمل ادراک رکھتی ہیں اور افراط وتفریط سے بچنے کی حتی المقدور کوشش کرتی ہیں۔ وہ اس عظیم مقصد کی مقصدیت سے مکمل آگاہ ہیں۔ وہ اپنے قاری کو ہر طرح کی الجھن سے ماورا رکھنا چاہتی ہیں۔ ان کا اسلوبِ شعر ہر ذہنی سطح کے قاری کے قریں تر ہے۔ گویا انہوں نے عوام الناس کے لیے اکتسابِ فیض کے ابواب وَا کر دیے ہیں اور قرآن فہمی کے عمل کو سہل تر کر دیا ہے۔ عروضی حوالے سے انہوں نے عروض وضرب میں ایک حرف کی کمی بیشی روا رکھی ہے۔ جس سے فقط فکرِ قرآں کا احاطہ مقصود ہے۔ اس لیے انہوں نے کہیں بحرِ متقارب مثمن محذوف الآخر کو بروئے کار لایا ہے جس کا عروضی وزن فعولن فعولن فعولن فعل ہے تو کہیں وہ بحر متقارب مثمن مقصور الآخر کو زیرِ استعمال لائی ہیں جس کے عروضی ارکان فعولن فعولن فعولن فعول ہیں۔ پارہ ۸ اور سورۃ الاعراف کی ابتدائی آیت کے مفہوم کو انہوں نے بحر متقارب مقصور الآخر میں پیش کیا ہے جبکہ اس سے آگے والی آیات کے لیے انہوں نے بحر متقارب مثمن محذوف الآخر کا سہارا لیا ہے۔ ان کے پیش نظر صرف اور صرف قرآن مجید فرقانِ حمید کی فکر کی مکمل ترجمانی کا مقصد تھا۔ سورۃ الاعراف کی چند ابتدائی آیات کا منظوم مفہوم سپردِ قرطاس ہے۔

نبیؐ جی پہ نازل ہوئی ہے کتاب
بنایا خدا نے ہے اس کا نصاب

نہ محسوس تنگی نہ کچھ بوجھ ہو
ذرا منکروں کو ڈراتے رہو
نصیحت ہے یہ مومنوں کے لیے
ہدایت کے رستے پہ جو ہیں چلے
کوئی بات مت دوسروں کی سنو
جو رب نے بتایا ہے وہ ہی کرو
تباہ کر دیں ہم نے کئی بستیاں
عذاب ان پہ اپنا کیا تھا عیاں

(ص:۱۲۴)

اگر عروضی قواعد وضوابط کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے تو یہ حقیقت مبینہ طور پر سامنے آتی ہے کہ عروض وضرب میں ایک حرف کی کمی بیشی روا ہوتی ہے تو اس سلسلے میں شہناز مزمل مکمل طور پر اس رعایت سے ماہرانہ انداز میں فائدہ اٹھاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

عربی زبان کا شمار دنیا کی مشکل ترین زبانوں میں ہوتا ہے کیونکہ لسانِ ہذا کا دائرۂ کار بہت وسیع ہے۔ان کا یہ کام کس قدر مشکلات اور کٹھنائیوں سے عبارت تھا، یہ صرف وہی لوگ جانتے ہیں جو عربی زبان کی باریکیوں کا ادراک رکھتے ہیں۔ یہ ایک کٹھن فریضہ تھا جس سے وہ عہدہ برآ ہوئی ہیں۔ ماقبل بحر و وزن میں پارہ ۱۲ سورۃ یوسف کی ابتدائی چند آیات کا منظوم مفہوم درج ذیل ہے:

ہے واضح ہر آیت ہی قرآن کی
جو رب نے تمہارے لیے بھیج دی
اسے عربی میں کر دیا ہے رقم
سمجھ پاؤ اس کو جو پاؤ فہم
ہے قران نازل بھی ہم نے کیا

اور اک داستاں دی تمہیں ہے سنا
یقیناً کوئی علم پہلے نہ تھا
کہ سیکھا وہی جو ہے ہم نے کہا
کہا جب یہ یوسفؑ نے اے ابا جان
میں خواب اپنا تجھ سے ہوں کرتا بیان
گیارہ ستارے قمر شمس سب
کریں سجدہ مجھ کو بنا کیا سبب؟
کہا پھر یہ یوسفؑ سے یعقوبؑ نے
نہ بھائی ترے خواب ہرگز سنیں
کریں گے وہ تدبیر اس پر کوئی
نکالیں گے تعبیر اس کی بری
کہ شیطاں ہے دشمن کھلا آپ کا
نہیں چاہتا وہ کسی کا بھلا
کرے گا تجھے رب عطا اک مقام
کہ حاصل رہے گا تجھے بس دوام

(ص:۱۸۶)

ماقبل بحر و وزن میں کہی گئی چند آیات کا منظوم مفہوم جن کا تعلق پارہ ۱۵ سورۃ الکہف کے ابتدائی حصے سے ہے، درج ذیل ہے:

ہے تعریف اس کے لیے بے حساب
اتاری ہے بندے پہ جس نے کتاب
نہیں ٹیڑھ کوئی ہے اس میں رکھی
نہ افراط و تفریط ہے کوئی کی

عذابِ خدا سے ڈراؤ انہیں
جو مومن ہیں مژدہ سناؤ انہیں
بنائی ہے جنت اک ایسی جگہ
جہاں پر وہ رہتے رہیں گے سدا
جو کہتے ہیں اولاد رکھے خدا
نبیؐ جی ذرا ان کو دیں یوں ڈرا
کوئی علم ہرگز نہیں ان کے پاس
ہے اجداد پر رکھی سب نے اساس

(ص:۲۲۹)

تحقیقی وانتقادی حوالے سے ہر کام کی نسبت سے کچھ نہ کچھ کہنے کی گنجائش ضرور ہوتی ہے۔ اگر فنی حوالوں سے عروضی تقاضوں کی مکمل پاسداری کی جاتی تو نتائج کی ضوفشانی اپنی تاب وتمکنت میں اضافے کی حامل ہو جاتی۔ اگر قرآن مجید کی مکمل انتظامی تقسیم یعنی آیت نمبر، رکوع، الربع، النصف اور الثلثہ کا لحاظ رکھا جاتا تو تحقیقی امکانات کی بازیافت کا عمل سہل تر ہوتا اور افراط وتفریط کی نشاندہی میں آسانی ہوتی۔ بہرحال ان تمام معاملات کے باوجود بھی شہناز مزمل کا یہ کارنامہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے جس کے باعث انہیں جہانِ فکر وفن میں نمایاں مقام ومرتبہ حاصل ہے جسے فردائی ادوار میں بھی بھرپور انداز میں سراہا جائے گا کیونکہ وہ قرآن فہمی کے ابواب وَا کرنے میں کامیاب وکامران ہوئی ہیں۔ امید ہے کہ ان کا یہ عظیم کام ان کے لیے توشہء دنیا وعقبیٰ قرار پائے گا۔

باب چہارم

ڈاکٹر شہناز مزمل کی نظم نگاری

تاریخِ عالم کے ہر عہد میں شاعری فنونِ لطیفہ کا محبوب ترین شعبہ رہا ہے۔ اسے وہ مقبولیت و پذیرائی میسر آئی جو کسی اور کے حصے میں نہ آئی۔ علم البشریات کی رو سے حضرتِ انسان کا ارتقائی سفر ہر دور میں جاری و ساری رہا ہے۔ انقلابی تبدیلیوں کا یہ عمل زندگی کے تمام شعبوں پر محیط رہا ہے۔ انسانی ارتقا کے نتیجے میں نطق و بیاں کے سلسلے وسیع تر ہوتے چلے گئے اور پھر ان سلسلوں کو جادۂ منزل پر رواں دواں رہنے کے لیے ادب نے سہل تر کر دیا۔ جہاں نثر نے فروغ پایا، وہاں شاعری بھی کہیں پیچھے نہ رہی۔ بلکہ اس کا سفر تند و تیز رہا ہے۔ کسی بھی شعبے میں درجہ بندی کا عمل بھی اس کے ارتقا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پھر شاعری کو فکری اور ساختیاتی اعتبار سے منقسم ہونا پڑا جس کے منطقی نتیجے کے طور پر موضوعاتی اور ساختیاتی اعتبار سے کچھ ہیئتیں معرضِ وجود میں آئیں جن میں غزل اور نظم کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اردو شاعری کلاسیکی عہدِ نظم کے بامِ عروج سے عبارت ہے اور پھر اہلِ ذوق کے شعری مزاج کی رواداری کے نتیجے میں غزل بھی مقبول ہونا شروع ہوئی۔ غزل اور نظم نے اپنی تاریخ کے عروج و زوال کے مختلف ادوار دیکھے۔ عہدِ موجود میں اگرچہ غزل کو کچھ بالادستی حاصل ہے مگر کہا جاتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آنے والا دور نظم کا ہی دور ہو۔ نظم کے حوالے سے محمد عقیل روبی کہتے ہیں کہ کسی بھی سخنور کا اصل تخلیقی جوہر جس میں اس کی فکری وسعت کا اندازہ ہوتا ہے، نظم میں ہی کھل کر سامنے آتا ہے۔ کیونکہ چند عمدہ غزلیں تو استاد کی جوتیاں سیدھی کرتے ہوئے لکھی جاتی ہیں۔ عام طور پر یہ رائے

پائی جاتی ہے کہ غزل فن کے زور پر پروان چڑھتی ہے جبکہ نظم فکر کے زور پر استوار ہوتی ہے۔

شذرہ ہذا میں ہم شہناز مزمل کی نظم نگاری کے تناظر میں رقم طراز ہیں جس کے حوالے سے لکھنے کے لیے تو دفتروں کے دفتر درکار ہیں مگر ہمارا تجزیاتی مطالعہ مُشتے از خروارے کے بمصداق ہوگا اور دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی جائے گی۔طولِ بیان سے بچنے کے لیے تاکہ قاری کی طبع، نازک پر گراں نہ گزرے۔حتی المقدور کم سے کم نظمیات کا انتخاب کیا جائے گا اور انہیں بطور استشہادات برائے استخراجات لایا جائے گا۔

شہناز مزمل جہانِ شعروادب میں کارِ بسیار انجام دے چکی ہیں۔ان کا تصنیفی تعدد ۴۳ کے ہندسے پر جا پہنچا ہے۔چار عدد برقی کتب ان کے علاوہ ہیں۔ان کی ان تصانیف میں چار ضخیم کتب، "منتہائے عشق" (کلیاتِ غزل) مطبوعہ جنوری ۲۰۱۹ء، "ندائے عشق" (کلیاتِ نظم) مطبوعہ ۲۰۱۹ء "انتہائے عشق" (کلیاتِ حمد ونعت) مطبوعہ ۲۰۲۰ء اور "نورِ فرقان" (قرآن مجید کا منظوم مفہوم) مطبوعہ ۲۰۲۰ء شامل ہیں۔شذرہ ہذا میں ہم ان کی کلیاتِ نظم "ندائے عشق" میں سے منتخب نظموں کو شاملِ تجزیہ کریں گے۔ان کی نظم کی اس کلیات میں ان کے درج ذیل مجموعہ ہائے کلام شامل ہیں۔

۱۔ عکسِ دیوار پہ تصویر

۲۔ موم کے سائباں

۳۔ میرے خواب ادھورے ہیں

۴۔ عشق تماشا

۵۔ عشق سمندر

۶۔ تیرے بعد

ان شعری مجموعوں کے علاوہ نظم کی اس کلیات میں دو نظمیں "دسمبر لوٹ آتا ہے" اور "نیا سورج" سے موسوم ہیں۔ان کی نظم کی اس کلیات "ندائے عشق" کے تاثرات نگاروں میں رضیہ اسماعیل اور عثمان صدیقی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔پیش لفظ شاعرہ مذکورہ نے خود لکھا ہے۔

شہناز مزمل نے زیادہ تر نظم، نظمِ آزاد اور نظمِ معریٰ کی ہیئت میں کہی ہے۔ البتہ کہیں کہیں دیگر پابند نظموں کے ہیئتی شواہد بھی ملتے ہیں۔ قارئین کی صراحت کے لے ناگزیر ہے کہ نظمِ معریٰ اور آزاد نظم کی عروضی مغائرت کو واضح کر دیا جائے۔ نظمِ معریٰ کے تمام مصارع میں عروضی ارکان کی تعداد یکساں ہوتی ہے۔ یعنی تمام مصرعے مساوی الوزن ہوتے ہیں جبکہ آزاد نظم کے عروضی ارکان میں ایک تعدادی تفاوت ہوتا ہے یعنی کہیں ایک رکن ہوتا ہے تو کہیں تین رکن ہوتے ہیں۔ گویا ارکان کی تعداد میں پابندی روا نہیں رکھی جاتی البتہ بحر یا وزن کی پابندی ناگزیر ہوتی ہے۔

اس وقت شہناز مزمل کی نظم کی کلیات "ندائے عشق" ہمارے روبرو ہے۔ ہم سب سے پہلے ان کی کلیات میں موجود پہلے مجموعہء کلام "عکسِ دیوار پہ تصویر" کی نظمیات کی نسبت سے بات بڑھاتے ہیں۔ اسی طرح دیگر مجموعہ ہائے کلام کی منتخب نظمیات بھی یکے بعد دیگرے زیرِ بحث آئیں گی۔

ان کی نظم کے فحوائے بیان میں طربیہ تاثرات کی بہار سامانی بھی ہے، فکری بیداری کے حوالے بھی ہیں، پندارِ انا کا مذکور بھی ہے، سماجی جکڑ بندیوں کی آنچ بھی شدید تر ہے۔ ایک سخت گیر قسم کا احساسِ محرومی ہے جو شدتِ احساس اور زورِ بیان کے تلازمات کو فزوں تر کر رہا ہے۔ تگ و تازِ حیات اور سعیِ پیہم کا بھرپور آدرش بھی ہے۔ ترقی پسندی اور انسان دوستی کے شواہد بھی تندرست و توانا ہیں۔ ان تمام ترحزنیہ اور طربیہ عوامل کے باوجود بھی وہ مستقبل سے مایوس نہیں دکھائی دیتیں۔ ان کی ایک نظم "خوش آئند لمحوں کی تلاش" اسی پسِ منظر میں ملاحظہ کریں جو نظمِ معریٰ کی ہیئت میں ہے۔ یہ نظم جس بحر و وزن میں کہی گئی ہے، اسے ماہرینِ عروض نے کوئی باضابطہ بحر کا نام نہیں دیا۔ اس کا عروضی وزن "مفاعلاتن مفاعلاتن" ہے جسے مربع وزن سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ بحر رجز یا کامل سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ بحر ہذا کا شمار بحورِ مستحدثہ میں ہوتا ہے۔ بحورِ مستحدثہ ایسی بحور کو کہتے ہیں جن کے اوزان دوسری بحور سے لیے جاتے ہیں۔ ان کی یہ نظم Dimentional poetry کے زمرے میں آتی ہے جسے کثیر الجہتی نظم کہا جا سکتا ہے اور شاعرہ مذکور کے کثیر الموضوعات ہونے کی مبینہ دلیل بھی ہے۔

ہوں اپنی فکر وانا کی قیدی
میں دائروں کی اسیر ہو کر
مکیں ہوں ایسے مکان کی جو
گماں گزرتا ہے گھر نہیں ہے
اندھیروں کے سرسراتے پیکر
اترتے رہتے ہیں بستیوں پر
کرن کرن کو ترسنے والے
اندھیری بستی میں بسنے والے
تلاشنے کو نکل پڑے ہیں
چھپا کہیں آفتاب ہوگا
کبھی تو کم یہ عتاب ہوگا
کوئی تو ہوگا جو بستیوں میں
چراغاں کرنے کا عزم لے کر
دِیوں کو لو بانٹتا پھرے گا
شبِ سیہ کو چراغ دے کر
رُخِ سحر کو اُجال دے گا

(ص:۲۶)

سماجی جکڑ بندیوں کے باعث اظہار پابندِ سلاسل ہے، فکر پر پہرے ہیں تو زبان گنگ ہے۔ اسی کیفیت نے دروں کی دنیا میں ایک محشر بپا کر دیا ہے۔ دل کے نہاں خانے میں ہر خواہش ایک حسرت کا روپ دھار کر سینے کا داغ بن چکی ہے۔ نینوں سے نندیا کی دیوی نالاں ہے جس کا لازمی سبب کربِ پیہم ہے۔ زخم ہیں جن کا مرہم ومداوا میسر نہیں ہے۔ راستوں کے نقش دھندلا چکے ہیں تو منزلیں گریز پا ہیں۔ اس طویل مسافت میں ہم سفر تھک ہار چکے ہیں۔ نہ کوئی چارہ گر بہم ہے اور نہ

کہیں سکونِ دل کی توقع ہے۔شہناز مزمل کی نظمیات میں حزنیہ شعری طبع پورے طور پر کارگر ہے جس میں شدتِ احساس اور زورِ بیاں کے تلازمات اپنے پورے کروفر سے کارفرما ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی نظم کی مقبولیت کا گراف تواتر سے بڑھتا جا رہا ہے۔اسی تناظر میں ان کی ایک اور نظمِ معریٰ "یورشِ افکار" جو بحر ہزج مثمن سالم میں ہے، جس کا عروضی وزن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ہے۔

مری سوچوں پہ پہرے ہیں زباں میری بھی اب چُپ ہے
میں اس افکار کی یورش کو لے کر اب کہاں جاؤں
مرے اندر دہکتا ہے الاؤ کیسے بتلاؤں؟
نہاں ہیں داغ سینے میں کسی کو کیسے دکھلاؤں؟
مری آنکھوں سے نیندیں چھین لی ہیں کربِ پیہم نے
بتا، زخموں کا مرہم ڈھونڈنے میں کس جگہ جاؤں
مری راہوں کے سارے نقش مدہم ہو گئے ہیں اب
مرے ساتھی بھی تھک کر راستے میں سو گئے ہیں اب
مجھے بتلا مسیحا ڈھونڈنے تجھ کو کہاں آؤں
وگرنہ یہ ہی بتلا دے سکونِ دل کہاں پاؤں

(ص: ۵۴)

شہناز مزمل فنِ غزل گوئی کے حوالے سے ریاضتِ بسیار کی حامل ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں نظمِ معریٰ اور آزاد نظم میں بھی قوافی کا استخدام پایا جاتا ہے۔اس سلسلے میں مذکورہ بالا نظم کی مثال دی جا سکتی ہے۔

شاعری خود کلامی کا ایک روپ ہے۔یہ خود کلامی اپنی ذات کے حوالے سے بھی ہو سکتی ہے اور محبوب کی نسبت سے بھی ہو سکتی ہے۔انسان کا زیادہ تر تکلم مذکورہ معاملات سے ہوتا ہے۔شہناز مزمل کی نظم "خود کلامی" جو نظمِ معریٰ کی ہیئت میں ہے، اور بحر خفیف مسدس سالم مخبون محذوف میں

ہے۔ یہ ایک مرکب بحر ہے۔ نظمِ معریٰ اور آزاد نظم میں سخنور کو قوافی اور ردیفوں کی رعایت حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے شہناز مزمل نے ان ہیئتوں کو بکثرت برتا ہے۔ مذکورہ نظم میں شہناز مزمل کا تکلم اپنے محبوب سے ہے جس میں غمخواری اور غمگساری کا حوالہ بھی ہے۔ عالمِ ہجراں شدید تر ہے مگر عہدِ وصال کی یادیں بھی تر و تازہ ہیں اور وصل کے خواب تواتر سے دیکھے جا رہے ہیں۔ خوابوں کے ادھورے رہنے کا ملال بھی ہے کیونکہ دنیا میں کسی کے خواب پورے نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ہم نفس کا احتساب کرتی رہتی ہیں۔ اس نظم کا مزاج مجموعی طور پر حزنیہ ہے۔ نظم ملاحظہ کریں۔

میرے اندر جو شخص رہتا تھا
ساتھ میرے جو کرب سہتا تھا
وہ تو کب کا بچھڑ گیا مجھ سے
ایک دھندلا سا نقش باقی ہے
جو مری یاد کے ہیولے میں
آ کے اکثر مجھے رُلاتا ہے
یاد اپنی مجھے دلاتا ہے
سوچتی ہوں کبھی ہوا ایسا بھی
ساتھ اپنے رہے سدا کوئی
کر نہ پائے اسے جدا کوئی
ڈھلتے سورج کے ساتھ ہی اکثر
خود ہی خود سے سوال کرتی ہوں
خواب اکثر ادھورے رہتے ہیں
کس کو ملتی ہیں ان کی تعبیریں
نفس کو احتساب دیتی ہوں
خود ہی خود کو جواب دیتی ہوں

وہ جو بچھڑا تھا شخص مجھ سے تب
ہم نفس وہ نہیں ہے میرا اب
اب تو دنیا کے سنگ رہتی ہوں
غم زمانے کے ہنس کے سہتی ہوں
جو بھی کہتی ہوں، خود سے کہتی ہوں
کوئی حسرت نہ کوئی ارماں ہے
آج کچھ اس طرح سے جیتی ہوں

(ص:۶۰-۶۱)

شہناز مزمل کی نظمیات میں حقیقت پسندی بھی ہے اور مصلحت پسندی کا عنصر بھی نمایاں ہے۔ وہ ہر قسم کے حالات سے سمجھوتہ کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔ جہاں ان کے ہاں سماجی حوالے سے تنقیدی رویے پائے جاتے ہیں، وہاں خود احتسابی کا عمل بھی تیز تر ہے۔ کہیں کہیں استفہامیہ اشارات التزام ان کے نفسیاتی وحسیاتی اور فلسفیانہ گراف کو بلند تر کر دیتا ہے۔

اب ہم ان کے دوسرے مجموعہ کلام "موم کے سائباں" کی منتخب نظمیات کی نسبت سے اپنے تجزیاتی عمل کو آگے بڑھاتے ہیں۔ عمومی مشاہدے کی بات ہے کہ اکثر و بیشتر شعرا اپنے شعری مجموعے کا نام اپنی کسی غزل کی ردیف یا کسی شعر یا کسی قطعہ یا نظم سے اخذ کرتے ہیں یا کسی نظم کے عنوان کو ہی اپنے مجموعہء کلام کا نام دے ڈالتے ہیں۔ ایسا کرنا ناروا تو نہیں ہے مگر اس میں تن آسانی کا پہلو بھی پوشیدہ ہے۔ کیونکہ کچھ تحقیقی و انتقادی تلازمات کو ملحوظِ خاطر رکھنے کا عمل شاعرانہ کم اور ناقدانہ زیادہ ہے۔ اس لیے کتابِ شعر کا نام اس کتاب کے غالب تاثر کی نمائندگی سے مملو ہونا چاہیے۔ ماقبل صورتِ حال کے پیشِ نظر مجموعہ کلام کا نام کسی شعر، غزل کی ردیف، قطعہ یا نظم کی نمائندگی تو کر سکتا ہے مگر مجموعی طور پر یہ مجموعہء شعر کی نمائندگی سے قاصر ہوتا ہے۔

ماقبل مجموعہ کلام کی پہلی اور منتخب آزاد نظم "موم کے سائباں" ہے جسے ہم بدونِ تجزیہ نذرِ قارئین کرتے ہیں اور اس کا تبصرہ قارئین کی صوابدید پر چھوڑتے ہیں۔ دیدہ باید کہ وہ اس حوالے

سے کیا رائے قائم کرتے ہیں۔

سکوتِ شام میں بجتی ہوئی گھنٹی کی آوازیں
افق پر ڈوبتے سورج کی سرخی
تیرتے بادل
فضا میں ہر بدلتی رت کی چاروں اور ہے خوشبو
وہی منظر کسی سپنے صورت آنکھ کی پتلی میں رہنے دو
ہجومِ بیکراں میں کوئی سمجھا ہے نہ سمجھے گا
کسی برگد کا دکھ اور ڈار سے بچھڑی ہوئی اک کونج کی لمبی اڑانوں کو
سبھی کھوئے ہوئے ہیں بس حصارِ ذات کے اندر
چمکتی تیز آنکھوں کو مچانوں پر سجایا ہے
مگر تاریکیاں اندر ہی اندر بڑھتی جاتی ہیں
سلاسل یاس کے پھیلے
سمندر دور دریا دور بادل دور ہیں جاناں
کڑی ہے دھوپ
منزل کا نہ کوئی بھی نشاں نکلا
کسی دیوار کا سایہ
نہ کوئی ابرِ رحمت ہے
یہاں کے سائباں سارے کے سارے موم کے جاناں
ہجومِ بیکراں ہے
اور اب ان سائبانوں میں
جو جلتی آگ میں قطروں کے جیسے بہہ رہے ہیں اور
اماں کیسے ملے گی؟

کون ٹھہرے گا یہاں پر اب؟
ہجومِ دہر کو کیا ہو گیا
ہر اک خواہش کو آنکھوں کی مچانوں پر سجایا ہے

(ص: ۶۴-۶۵)

شہناز مزمل کی نظمیات میں عزم و حوصلے کی آبیاری بھی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا طرزِ بیاں حزنیہ نوعیت کا حامل ہے۔ عام طور پر یہ رائے قائم کی جاتی ہے کہ نظم کے فحوائے بیان میں خارجیت کا عنصر بکثرت ہوتا ہے۔ مگر ان کے ہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ان کی نظموں میں داخلیت کو وفور حاصل ہے۔ گویا ان کی غزل کی طرح ان کی نظم بھی داخلی اظہار سے عبارت ہے جس کے باعث ایک تجسس کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ حسیاتی و نفسیاتی اور فسلفیانہ شواہد کو نمو میسر آتی ہے۔ ان کے ہاں جوابی رویے بھی پورے وثوق سے ملتے ہیں۔ ان کی نظموں میں موجود کلائمکس قارئین کے اذہان و قلوب میں بہت سے سوالات پیدا کر جاتا ہے، اسی نسبت سے ان کی نظم "مری ہتھیلی یہ خواب دینا" قابلِ ذکر ہے جو نظمِ آزاد کی ہیئت میں ہے۔ اس کے اولیں مصرع میں دو حرف کی افراط اور دوسرے مصرع میں دو حرف کی تفریط نے اسے نظمِ آزاد کے زمرے میں لا کھڑا کر دیا ہے بصورتِ دیگر یہ ایک نظمِ معریٰ ہوتی۔ نظم ہذا مربع وزن مفاعلاتن مفاعلاتن میں کہی گئی ہے۔ یہ وزن بحر رجز اور بحر کامل سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

دہکتے لمحوں سے بچ نکلنے کا
راستہ میں تلاش کر لوں
مگر یہ لمحے جو خود سلگ کر
در آئے ہیں آج میرے اندر
جواب مجھ سے طلب کریں گے
کہ ہم نے تیری ہی حسرتوں کے
چراغ روشن کئے تھے ہر دم

مزارِ حسرت دیا تھا تو نے
دہکتے لمحے جواب ہوں گے
مری تمنا کا جستجو کا
مری ہتھیلی پہ خواب ہوں گے
ادھورے ان کے جواب ہوں گے
دہکتے لمحو! جواب دینا
مری ہتھیلی پہ خواب دینا

(ص:۷۱-۷۲)

شہناز مزمل کی نظمیات میں بسا اوقات فکری انتشار اور تخیلاتی خلفشار کی کیفیت محسوس ہوتی ہے جسے اجتماعی کرب کا ردعمل بھی کہا جا سکتا ہے۔ جس سے لامحالہ طور پر ایک گومگو کا عالم پیدا ہو جاتا ہے۔ یوں فکر کے عدم مربوط ہونے کا تاثر قوی تر ہو جاتا ہے اور قارئین اور محققین کو استخراجی نتائج کی بازیافت میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یوں ان کی نظم پر آمد کی بجائے آورد اور داخلیت کی بجائے خارجیت کا گماں ہونے لگتا ہے۔

ان کے فکری کینوس میں اپنی مٹی کی بو باس رچی بسی ہے۔ اپنی مٹی سے ان کا رشتہ مضبوط بنیادوں پر استوار ہے۔ اس لیے وہ روایات و اقدار سے جڑی ہوئی ہیں۔ ان کے تخیلات میں مٹی ایک بھرپور اور تندرست و توانا فلسفے کے طور پر سامنے آئی ہے کیونکہ مٹی عناصرِ اربع کا ایک ساختیاتی جزو ہے جسے مبادی حیثیت حاصل ہے۔ انسان کی تخلیق بھی انہی عناصرِ اربع یعنی مٹی، آگ، ہوا اور پانی سے ہوئی ہے اور انہیں نظر انداز کرنے کا کوئی منطقی جواز نہیں ہے۔ اسی تناظر میں ان کی ایک آزاد نظم بعنوان "مٹی" محلِ نظر ہے جو بحر اوفر میں کہی گئی ہے جس کا سالم رکن مفعولاتن ہے۔ یہ بحر عہدِ امیر خسرو میں عاشق صادق نامی ایک ماہرِ عروض نے ایجاد کی، رسالہء جامع الصنائع میں مذکور ہے۔

مٹی لے کر ہاتھ میں اپنے

کب سے بیٹھی سوچ رہی ہوں
میں بھی مورت مٹی کی ہوں
مجھ کو ڈھالا رب نے میرے
میں یہ مٹی کیسے ڈھالوں
کوزے ڈھالوں
یا بت ڈھالوں
گھر میں لگواؤں
گور بناؤں
مٹی یہ بھی
مٹی میں بھی
کیوں نہ اب میں دور کی سوچوں
مٹی کھیلوں مٹی پہنوں
اور مٹی ہو جاؤں

(ص:۸۰-۸۱)

منظر نگاری اور محاکات نگاری شہناز مزمل کی نظم کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس سلسلے میں وہ مظاہرِ فطرت کا استخدام بھی بروئے کار لاتی ہیں۔ یوں ان کا سخن فطری رچاؤ کی ردا اوڑھ لیتا ہے اور اس کے سراپا آمد ہونے کا گماں گزرتا ہے۔ ان کی نظموں میں موجود کلائمکس حیرت و استعجاب اور تجسس کے ابواب وا کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے جس سے ان کی شاعری میں جاذبیت اور اپنائیت کے خصائص آشکار ہوتے ہیں جو ان کے کلام کی دلپذیری اور ہر دلعزیزی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یوں ان کی اپنے قاری پر گرفت مضبوط ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور وہ اپنے قارئین کے حواس کو مستعد کرنے میں کامیاب و کامران ہو جاتی ہیں۔ یہ ان کے کے شعری بیانیے کا نکتۂ کمال ہے۔ بسا اوقات وہ اپنی نظم کے فحوائے بیاں میں بہت سی ان کہی باتیں بھی چھوڑ جاتی ہیں۔ یوں

ان کی نظم کا نفسیاتی وحسیاتی اور فلسفیانہ گراف بلند ہوتا ہے اور قاری ان کی نظم کے فکری خلا کو پر کرنے کے لیے محویت و استغراق کے عالم سے گزرتا ہے۔ یوں ان کی سخن سازی تاثیراتی کیفیات کو فزوں تر کر دیتی ہے۔ اسی تناظر میں ان کی ایک آزاد نظم بعنوان "زرد موسم" لائقِ التفات ہے جو بحر اوفر میں ہے جس کا سالم رکن مفعولاتن ہے۔ اس نظم میں اکثر و بیشتر ایک رکن کو بروئے کار لایا گیا ہے صرف دو سطور میں دو ارکان سے کام لیا گیا ہے۔ معاملہ ہذا بھی ان کی فنی چابکدستی کی دلیل ہے۔

شام نگر ہو
اور یہ سورج
جھیل کنارے ڈوب رہا ہو
سرخ ردا میں
لپٹا چہرہ
دھیرے دھیرے
بھیگ رہا ہو
بھیگی رت ہو
سرد ہوا ہو
اور جذبوں سے عاری چہرہ
زرد ہوا ہو

(ص:۸۹)

شہناز مزمل نے بہت سی رومانویت آمیز نظمیں بھی کہی ہیں۔ ہجر کی کیفیت چونکہ حزن و ملال سے عبارت ہوتی ہے، یوں ان کا کلام حزنیہ طرزِ فکر کا حامل ہو جاتا ہے۔ ہجر میں ایک محبت کی کیا وارداتِ قلبی ہوتی ہے، اس حوالے سے ان کی فکر میں بڑی وسعت پائی جاتی ہے۔ مگر یہ ایک مبینہ حقیقت ہے کہ ان کے ہاں عزم و حوصلے کی ایک نوید ملتی ہے اور وہ مستقبل کے حوالے سے نیک

تمنائیں رکھتی ہیں۔اس لیے ان کے ہاں استدعائیہ طرزِ سخن ایک فطری سی بات ہے۔اس پس منظر میں ان کی آزاد نظم بعنوان "سرد سناٹا" لائقِ توجہ ہے جو بحر ہزج میں ہے جس کا سالم رکن مفاعیلن ہے۔

بہت ہی خامشی ہے
کٹ رہے ہیں دن مرے جاناں
نہ کوئی سوچ میں ہلچل
نہ کوئی بات انہونی
رگ و پے میں اترتے سرد سناٹے نے
مجھ کو کر دیا جامد
خدایا!!
برف سوچوں کو مری پگھلا
نیا سورج جلا کر
میری یخ بستہ سی سوچوں کو روانی دے
مرے افکار کو مربوط کر اور زندگانی دے

(ص: ۹۳)

عروضی حوالے سے شہناز مزمل اپنی نظمیات میں مفرد و محذوف بحور کو بکثرت زیرِ استعمال لائی ہیں جن کی بدولت انکے کلام کے صوتی، صوری اور سماعتی حسن میں اضافہ ہوا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں کا آہنگ اور غنائیت اپنی مثال آپ ہے۔ان کی نظموں میں شکستِ ذات اور شکستِ خواب کے حوالے بڑے موثر انداز میں ملتے ہیں۔ جہاں آئینے شکستہ ہیں، آرزوئیں نڈھال ہیں، مسافتوں کا ملال ہے، گزشتہ ساعتوں کی بازیافت کا عمل تیز تر ہے، عہدِ ماضی کی محبتیں اور رفاقتیں ایک مثال بن چکی ہیں جن کی یادیں پیہم ستا رہی ہیں، جنوں فتنہ ساز ہے اور آگہی سراب صورت ہے۔گویا نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والا معاملہ ہے۔اس لیے وہ کسی بھی نوع

کے انقلاب سے گریزاں نظر آتی ہیں کیونکہ کسی بھی انقلاب کے نتیجے میں عذاب واضطراب کا سامنا ایک فطری عمل خیال کیا جاتا ہے۔ جس کی تاب لانے کا یارا وہ خود میں نہیں رکھتیں۔ ان کی ایک معریٰ نظم بعنوان "شکستہ آئینے" نذرِ قارئین ہے جو بحر ہزج مربع مقبوض میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان مفاعلن مفاعلن ہیں۔

بکھر گئی ہیں صورتیں
ہیں سب شکستہ آئینے
جو ہے پسِ خیال ہے
ہر آرزو نڈھال ہے
گریز پا ہوں میں ابھی
مجھے سکون چاہیے
مجھے وہ چند سانس دے
کہ میں خود اپنے آپ سے
لپٹ کر رو سکوں ذرا
مرے نصیب میں ہی کیوں
لکھی گئی مسافتیں
کہاں گئے وہ روز و شب
گئے دنوں کی ساعتیں
محبتیں رفاقتیں
ہے سوچ کیسی ہم سفر
نہیں ہے دل کو کچھ خبر
جنوں فتنہ ساز ہے
اور آگہی سراب ہے

عجیب رنگِ خواب ہے
مجھے امان دے کہ اب
نہیں ہے مجھ میں حوصلہ
کسی بھی انقلاب کا
کسی نئے عذاب کا
کسی بھی اضطراب کا

(ص:۱۰۶-۱۰۷)

ڈاکٹر شہناز مزمل کے نظمیاتی کینوس میں مختصر، متوسط اور طویل ضخامت کی حامل نظموں کا وجود پایا جاتا ہے۔ گویا ان کی نظم ضخامت کے اعتبار سے متنوع نوعیت کی حامل ہے۔ ان کی نظموں میں کربِ ذات، شکستِ ذات اور احساسِ محرومی شدید نوعیت کا ہے جسے آپ انفرادی یا اجتماعی دونوں حوالے قرار دے سکتے ہیں۔ ان کا دکھ ذاتی بھی ہوسکتا ہے اور کائناتی بھی ہوسکتا ہے۔ گویا ایک سماجی اور عمرانی حوالہ بھی ان کے ہاں پنہاں ہے۔ اکثر اوقات یہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ معاشرے کے مفلوک الحال طبقے کی نمائندگی کر رہی ہیں۔ جسے ان کی انسان دوستی یا ترقی پسندی قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان کی ایک آزاد نظم "فگار لہجہ" محلِ نظر ہے۔

فگار ہاتھوں سے کیا لکھوں میں
یہی لکھوں کیا
حیات ساری
حیات کرنے کی آرزو میں گزار ڈالی؟
کسے بتاؤں
فرار چاہا تھا زندگی سے
ضرورتوں سے حسیں رُتوں سے
بس ایک لمحے کی چاہ کی تھی

وہ ایک لمحہ تلاشنے میں
حیات ساری فگار گزری
فصیلِ جاں میں اسیر کر کے
مجھے تو محدود کر دیا تھا
ہو گر اجازت تو پوچھنے کی
مجھے بھی اتنا تو حق ہے حاصل
مرے لیے گر نہیں تھا کچھ بھی
کوئی ستارا
کوئی کنارا
تو کیوں سجائی تھی بزم ساری
میں دشتِ امکاں کی تھی مسافر
تلاشنا تھا مجھے وہ جادہ
جو مجھ کو ہستی کے اس گماں سے نکال پھینکے
سکون بخشے
سکون ایسا جو دائمی ہو
مرے لیے قریۂ یقیں ہو
طلسم جاں کے عذاب سہنے تھے گر یہاں پر
تو ایسی صورت نہیں تھی ممکن
کہ کوچۂ دائمی کے باسی
مقیم رہتے قریب تیرے
فگار ہاتھوں سے کیا لکھوں میں
فگار دل ہے فگار آنکھیں

فگار کائنات ساری
فگار ہاتھوں سے کیا لکھوں میں

(ص:۱۲۸ تا ۱۳۰)

شہناز مزمل کی نظمیاتی فکریات میں نسائی احساسات کی جھلک واضح طور پر مشاہدہ کی جا سکتی ہے کیونکہ وہ بنتِ حوا کے سماجی مقام و مرتبہ سے بخوبی واقف ہیں۔ اس حوالے سے عمرانی جکڑ بندیوں سے بھی واقف ہیں۔ وہ دھیمے اور مدھر لہجے میں آزادیٔ نسواں کی بات کرتی ہیں اور اس کے بنیادی حقوق کی بازیافت چاہتی ہیں۔ ان کی نظم کے فکری کینوس میں جہاں مظاہرِ فطرت کی نمو پاشی ہے، وہاں بہاریہ خصائص بھی آشکار ہوتے ہیں۔ اسی نسبت سے ان کی آزاد نظم "آزاد قیدی" قابلِ ذکر ہے جس کا عروضی وزن بحر رجز یا بحر کامل سے لیا گیا ہے اور رکن مفاعلاتن ہے۔

عجیب سی میری بے بسی ہے
میں ہو کے آزاد قید میں ہوں
مری تمنا کی دھجیاں تو بکھر چکی ہیں
کیوں میری سوچوں کے پنچھیوں پر
شکاریوں کی نظر لگی ہے
بصارتیں میری کھو گئی ہیں
سماعتوں پر لگا ہے پہرا
یہ بال و پر بھی بندھے ہیں میرے
بدلتے موسم کی کوئی خوشبو کوئی بھی آہٹ
مدھر فضا سے نہیں بلاتی
جو مجھ سے آزاد قیدیوں کو یقیں دلا دے
کہ یہ ہوائیں یہ سب فضائیں
گلوں کی دلکش حسیں قبائیں

یہ رنگ و بو، یہ جمیل پیکر
ہماری خاطر وجود پہنے جہاں میں اترے
ہماری خاطر خلا میں بکھرے ہیں چاند تارے
یہ کوہساروں کے سلسلوں کے جلال سارے بھی ہیں ہمارے
مگر ستاروں کا رت جگا اب
مری ہی پلکوں پہ آرکا ہے
یہ گرتی شبنم کے نرم قطرے
مرے ہی گالوں پہ رک گئے ہیں
عجیب سی میری بے بسی ہے
میں ہو کے آزاد قید میں ہوں
بصارتیں میری کھو گئی ہیں
سماعتوں پر لگا ہے پہرا
یہ بال و پر بھی بندھے ہیں میرے
عجیب سی میری بے بسی ہے

ص: ۱۳۴-۱۳۵)

شہناز مزمل کے تخاطب بدلتے رہتے ہیں۔ کہیں وہ خدائے بزرگ و برتر سے مخاطب ہیں تو کہیں ان کا تخاطب برسرِ اقتدار طبقے سے ہے، کہیں وہ اپنے محبوب سے مخاطب ہیں تو کہیں ان کا تخاطب ظالم اور بے حس سماج سے ہے۔ ان کی فکر کی یہی ہمہ گیری ان کی تخلیقی وسعت اور ارتقا کی دلیل ہے۔ ان کے تخیلات میں نالہ وشیون کے معاملات بھی ہیں تو کہیں شکوہ وشکایت کا پہلو غالب نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں طنزیہ شواہد بھی ہیں اور تنقیدی رویے بھی ہیں۔ وہ اپنے معاشرے کے محروم اور پسے ہوئے طبقے کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اس لیے وہ ان سے ہمدردی کا جذبہ رکھتی ہیں۔ ایک خوائے غم خواری وغمگساری انہیں ودیعت کی گئی ہے جو ان کے پرخلوص جذبوں اور مروت کی

علامت ہے۔اسی نسبت سے ان کی ایک آزاد نظم "رزق ہوا" سپردِ قرطاس ہے جو بحر متدارک میں کہی گئی ہے جس کا سالم رکن فاعلن ہے۔

ہم خزاں سوختہ
تیری گل پوش وادی میں آ بھی گئے
اس سے کیا فائدہ
ہم ہیں اوراقِ گل!!
ہے ازل کا نوشتہ ہمارے لیے
ٹہنیوں پر اگیں
خوب پھولیں پھلیں
زرد موسم کے آتے ہی جھڑنے لگیں
وہ شجر جس پہ ہم نے لیا تھا جنم
اپنے ہاتھوں سے کر دے سپردِ ہوا
ہم ہیں اوراقِ گل یہ ہے اپنی سزا
کچھ بنیں گردِ راہ
کچھ ہوں رزقِ ہوا
آسمانوں سے بارش برستی رہی
خشک بنجر زمیں جو ترستی رہی
اپنے مدفن پہ جشنِ بہاراں ہوا
راستے وادیاں
یہ فضا یہ سماں
سب ہیں گل پوش اب
ہم خزاں سوختہ

تیری گل پوش وادی میں آ بھی گئے
اس سے کیا فائدہ
وقت کا نوحہ گر تو کہے گا یہی
تم ہو رزقِ ہوا
تم ہو رزقِ ہوا

(ص:۱۶۶-۱۶۷)

شہناز مزمل کی شعریات میں نظریہء ادب برائے زندگی اور نظریہ ادب برائے ادب دونوں کے بھرپور شواہد ملتے ہیں اور توازن حسن و خوب صورتی کا دوسرا نام ہے۔ان کے ہاں لسانی ارتقا کی مثالیں خوب صورت مرکبات کی صورت میں ملتی ہیں۔انہیں روایات سے بے پناہ محبت ہے اور گزشتہ ساعتوں کی بازیافت ان کا محبوب ترین موضوع رہا ہے۔بچپن سے فطری لحاظ سے ہر انسان کو پیار ہوتا ہے جس کا اظہار وہ مختلف انداز سے کرتا ہے کیونکہ بچپن انسان کی زندگی کا وہ حصہ ہے جو ہر انسان کی یادداشت کے گوشوں میں کسی نہ کسی صورت محفوظ ہوتا ہے۔ان کی ایک فطری نوعیت کی نظمِ معری جو "بچپن" سے معنون ہے،جس میں بحر رمل مثمن محذوف کو بروئے کار لایا گیا ہے،جس کا عروضی وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہے، ملاحظہ کریں کہ انہوں نے بچپن کی حسیں جزیات کے لیے پیشکش کا خوبصورت انداز اختیار کیا ہے۔

ریت کے ساحل پہ کچے گھر بنانا توڑنا
تتلیوں کے پر ہتھیلی پر سجانا دیکھنا
شام کی دہلیز پر آنچل دھنک رنگ آس کا
ڈوبتے سورج کے سائے میں بکھرتا دیکھنا
دن ڈھلے یونہی کھڑے رہنا گھنے پیڑوں تلے
گھر پلٹتے پنچھیوں کی خیریت کا پوچھنا
مٹھیوں میں جگنوؤں کو بند کر کے دیر تک

جگمگاتی سرخ ہوتی انگلیوں کو دیکھنا
سب حسیں منظر نگاہوں میں چھپا کر رات بھر
نیند کے ساحل پہ چلنا خواب رستے ڈھونڈنا
وقت کی اس دوڑ میں مجھ کو بہت اچھا لگا
برق رفتاری سے تھکنا پیچھے مڑنا دیکھنا
کسی قدر تسکین ملتی ہے مجھے اس امر سے
یاد کرنا بیتی باتیں اور گھنٹوں سوچنا

(ص: ۱۹۳-۱۹۴)

اب ہم ان کی کلیات "ندائے عشق" مطبوعہ ۲۰۱۹ء میں شامل ان کے مجموعہ کلام "عشق تماشا" کی منتخب نظمیات کی بابت اپنے موضوع کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔

شہناز مزمل کی شاعری کا مرکزی فلسفہ عشق ہے جسے معرفت ومجاز دونوں حوالوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ان کے اس مکتبِ فکر میں بڑی وسعت پائی جاتی ہے۔ان کے عشقیہ اعماق وآفاق قاری کو محصور ومسحور کر دیتے ہیں۔ان کے ہاں تصوف کے دونوں نظریوں "ہمہ اوست" اور "ہمہ از اوست" کی ایک منظم ومنضبط جانکاری ملتی ہے۔ان کی ایک نظمِ معریٰ جو "دل دریا عشق سے معنون ہے، میں واضح انداز میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔نظم ہذا بحر اوفر مربع سالم میں ہے جس کے عروضی ارکان مفعولاتن مفعولاتن ہیں۔

عشق سمندر کیسے پہنچوں
دریا رستے میں اتنے ہیں
آگ کے دریا خون کے دریا
دل بھی دریا آنسو دریا
دریا اندر بھی اک دریا
میں بھی دریا تو بھی دریا

عشق سمندر کیسے پہنچیں
دریا بن کر بہتے بہتے
آگے آگے بڑھتے جائیں
بہتے بہتے ڈھونڈ ہی لیں گے
عشق کا گہرا میٹھا ساگر
جس میں ہم کو کھو جانا ہے
عشق سمندر ہو جانا ہے

(ص:۱۹۶)

ان کی نظم "شکستہ کل کا نوحہ" عصری بے حسی کے خلاف ایک صدائے فلک شگاف ہے جس میں ایک عدم تحفظ کا احساس ہے جو پروان چڑھ رہا ہے۔ خود غرضی اور مطلب پرستی کے جذبوں کو ہوا مل رہی ہے۔ جنہیں تلخ سماجی رویوں کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ نظم ہذا بحر ہزج مسدس محذوف میں ہے جس کا عروضی وزن مفاعیلن مفاعیلن فعولن ہے۔

ہوا زہراب شہرِ نارسا سے
بکھرتے ٹوٹتے پر چن رہی ہے
شکاری گھات میں ہیں ساعتِ شب
اندھیرے کی مچانیں بُن رہی ہیں
زوالِ عہد میں لرزاں سماعت
شکستہ کل کا نوحہ سن رہی ہے

(ص:۱۹۹)

شہناز مزمل کی نظموں میں رعایتِ لفظی اور تکرارِ لفظی کے عمدہ امکانات ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی آزاد نظم "نہیں ملے گا" کا ابتدائی حصہ ملاحظہ کریں۔

وہ جل کے دیکھے

پگھل کے دیکھے
وہ گر کے دیکھے
سنبھل کے دیکھے
نہیں ملے گا نہیں ملے گا
جو چاہتا ہے

(ص:۲۰۰)

شہناز مزمل کی نظموں کے سیر حاصل مطالعہ کے بعد اور ان کے فکری وفنی گوشوں کی تجزیات کے عمل کے بعد یہ حقیقت اظہر من الشّمس ہوتی ہے کہ ان کی نظمیات فکری وفنی متقضیات سے ہم آہنگ ہیں۔ اگر دنیائے نظم میں ان کی ریاضت اسی تواتر سے جاری وساری رہی تو ان کے شاندار نظمیاتی مستقبل کی ضمانت قرینِ فطرت ہے۔

باب پنجم

ڈاکٹر شہناز مزمل کا معرفت آمیز سخن

کائناتِ فکر کا سب سے طاقتور تلازمہ عشق ہے جس کے اسباب وعلل میں یہ امر مبادی ہے کہ اس کی مقبولیت و دلپذیری میں مشیتِ ایزدی شامل ہے۔ علاوہ ازیں اس کے نظری و عملی شواہد بھی مضبوط و مستحکم ہیں۔ عشق کو عام طور پر دو زمروں یعنی معرفت و مجاز میں منقسم کیا جاتا ہے۔ معرفت یعنی عشقِ حقیقی خدائے بزرگ و برت سے والہانہ پن کا دوسرا نام ہے جسے تصوف کا نام بھی دیا جاتا ہے جس کے درج ذیل مدارج ہیں۔

۱۔ فنا فی النفس:

اس درجے میں انسان ادراکِ ذات حاصل کرتا ہے جسے عرفانِ ذات کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

۲۔ فنا فی المرشد:

یہ تصوف کا وہ مقام ہے جہاں انسان اپنے مرشد و ہادی سے محبت و عقیدت رکھتا ہے اور اس کی اطاعت قبول کرتا ہے۔

۳۔ فنا فی الرسول:

یہ تصوف کا وہ درجہ ہے جہاں ایک سالک رسولِ ختمی مرتبتؐ سے محبت اور عقیدت کا دم بھرتا ہے۔

۴۔ فنا فی اللہ:

یہ تصوف کا آخری سطح کا مقام و مرتبہ ہے جس کے باعث ایک صوفی اور خدائے بزرگ و برتر کے درمیان تمام فاصلے سمٹ جاتے ہیں۔

اہلِ تصوف منصور بن حلاج کو اپنا ہادی و پیشوا مانتے ہیں اور اس سے ہدایت قبول کرتے ہیں۔

عشق کی دوسری نوعیت عشق مجازی ہے جہاں کسی فردِ واحد یا خدائی مخلوقات میں سے کسی ایک چیز سے محبت و عقیدت روا رکھی جاتی ہے۔

اگر ہم شہناز مزمل کے سخن کے تناظر میں ان کے فلسفہ عشق کے پس منظر میں بات کریں تو ان کا عشق معرفت و مجاز دونوں پر محیط ہوتا دکھائی دیتا ہے مگر ان کا زیادہ فکری رجحان و میلان عشقِ حقیقی یعنی تصوف کی طرف زیادہ ہے۔ کچھ اربابِ فکر و نظر کے ہاں تصوف کی اصطلاح انتہائی ناپسندیدہ ہے مگر اس کے مروج و مستعمل ہونے کے باعث اس سے چشم پوشی کرنا یا اعراض برتنا دانش و حکمت کے منافی ہے۔

شذرہ ہذا میں ہم شہناز مزمل کے کلام کا تجزیہ مذکورہ موضوع کے تناظر میں کریں گے۔ اس سلسلے میں ان کی کلیاتِ غزل "منتہائے عشق" مطبوعہ جنوری ۲۰۱۹ء ہمارے روبرو ہے۔ کلیاتِ ہذا میں ان کے درج ذیل مجموعہ ہائے سخن شامل ہیں۔

۱۔ پیامِ نو	۲۔ جرأتِ اظہار
۳۔ جذب و حروف	۴۔ عکسِ دیوار پہ تصویر
۵۔ موم کے سائباں	۶۔ میرے خواب ادھورے ہیں
۷۔ عشق تماشا	۸۔ بعد تیرے
۹۔ عشق سمندر	۱۰۔ عشق مسافت
۱۱۔ عشقِ مسلسل	

ہم اپنے نفسِ مضمون میں ان کے ماقبل مجموعہ ہائے شعر سے یکے بعد دیگرے شعری استشہادات برائے استخراجات لائیں گے مگر ترتیبِ مذکور کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے گا۔ ہماری کوشش

رہے گی کہ انتقادی حوالے سے تمام تر تناظرات زیرِ بحث آئیں۔کلی تنقیدی تاثر کو اجاگر کیا جائے گا۔حتی المقدور یہ سعی کی جائے گی کہ ان کے تمام تر مجموعہ ہائے شعر مذکورہ بالا موضوع کے تحت زیرِ بحث لائے جائیں بشرطیکہ طولِ بیان کا خوف مانع نہ ہو۔

اگر فکری حوالے سے شہناز مزمل کی شاعری کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت اظہر من الشّمس ہوتی ہے کہ ان کے فحوائے بیاں میں عشق ایک روح پرور تلازمے کے طور پر سامنے آیا ہے۔حتیٰ کہ ان کے چار مذکورہ شعری مجموعے ایسے ہیں جن کے ناموں میں عشق کا لسانی اور فکری تلازمہ شامل ہے جس سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ شہناز مزمل کا خمیر عشق و تصوف سے گندھا ہوا ہے اور ان کا مقصدِ حیات بھی یہی ہے کہ جبینِ شوق کے سجدے ہوں اور ان کا آستانہ ہو، مزید یہ کہ میری نمازِ شوق کبھی قضا نہ ہونے پائے۔ان کے ہاں تصوف کے دونوں نظریے کارگر دکھائی دیتے ہیں جنہیں "ہمہ اوست" اور "ہمہ از اوست" سے عبارت کیا جاتا ہے۔ان کے فلسفہء تصوف میں مظاہرِ فطرت کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ان کی شعریات میں فقط حزن و ملال کے خصائص نہیں ہیں بلکہ بہاریہ عوامل اپنی مکمل بہار سامانی کے ساتھ عمل پیرا ہیں جس سے ایک طربیہ تاثر کی نمو ہوتی ہے۔اسی نسبت سے ان کے اولین مجموعہء کلام "پیامِ نو" سے ان کی ایک غزل کے تین اشعار قابلِ ذکر ہیں۔اشعار ہذا کا وزن بحر رجز یا کامل سے اخذ کیا جا سکتا ہے جس کے عروضی ارکان مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن ہیں۔یہ ایک مثمن سالم وزن ہے۔بحر ہذا کا شمار بحورِ مستحدثہ میں ہوتا ہے۔ان سے مراد ایسی بحور ہیں جن کے اوزان دوسری بحور سے لیے جاتے ہیں۔

جو نُور اُس نے فضا کو بخشا وہ نور مظہر ہے عظمتوں کا
عظیم رب کا عظیم جلوہ عظیم صبح دکھا رہی ہے
مہک ملی ہے گلوں سے اس کو بنی ہے گل ہر کلی چٹک کے
صباء بھی ہر سو لہک لہک کے ترانے اس کے ہی گا رہی ہے
پیا کہاں ہے پیا کہاں ہے پپیہا یہ پوچھتا ہے سب سے
بہار آئی ، بہار آئی صباء یہ مژدہ سنا رہی ہے

(ص:۲۱)

شہناز مزمل کی فکریات میں دنیاوی لالچ اور لوبھ قطعاً نہیں ہے۔ان کا مقصودِ حیات صرف اور صرف عشق ہی ہے۔اس لیے دنیاوی اعتبار سے ان کے ہاں حسرتوں کو وجود عنقا ہے۔وہ صرف اور صرف عشق کی انتہا چاہتی ہیں۔بقول شاعر:

مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں

وہ قربِ حقیقی کی خواہاں ہیں جسے وہ اپنی منزلِ حیات خیال کرتی ہیں۔ان کی ایک غزل کے دو اشعار نذرِ قارئین ہیں جو بحر متقارب مثمن سالم میں ہیں جن کے عروضی ارکان فعولن فعولن فعولن فعولن ہیں۔

نہیں کوئی حسرت تیرے اس جہاں کی
تیرے عشق کی انتہا مانگتے ہیں
ترا قرب پانے کی حسرت ہے یا رب
ٹھکانہ سوئے منتہیٰ مانگتے ہیں

(ص:۳۷)

اب ہم ان کے دوسرے شعری مجموعہ "جرأتِ اظہار" کو زیرِ تجزیہ لاتے ہیں۔شہناز مزمل کے ہاں تصوف کے تمام تر مدارج کا رنگ پایا جاتا ہے جن میں فنا فی النفس، فنا فی المرشد، فنا فی الرسول اور فنا فی اللہ شامل ہیں۔اگر ان کی غزل کو فنی زاویوں سے دیکھا جائے تو ان کے ہاں نئی ردیفوں کا چلن بھی پایا جاتا ہے جو ان کی فنی ندرت کی دلیل ہے۔فکری حوالے سے ان کے ہاں جذب وشوق کا عالم شدید تر ہے۔اسی حوالے سے ان کی غزل کا ایک شعر دیکھیے جو بحر رمل مثمن محذوف میں ہے جس کا عروضی وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہے۔

رہ گزارِ شوق میں ہم رکھ تو بیٹھے ہیں قدم
جانے کب منزل پہ ہو اپنی رسائی دیکھیے

(ص:۷۱)

فکری حوالے سے ان کے ہاں ایک سنجیدگی کا عالم پایا جاتا ہے۔ اس لیے ان کے ہاں معروضیت و معقولیت اور منطقیت بھی ہے۔ ان کی فکر اور کردار سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ وہ ایک درویش منش سالک ہیں۔ ان کے ہاں ایک مستقل مزاجی ہے جو بین الشعر کارفرما ہے۔

منزلِ حق و صداقت میں گرمِ سفر
رہ بدلنے نہیں دیتا میرا کردار مجھے

(ص:۷۵)

شہناز مزمل کا عشق بے لوث نوعیت کا حامل ہے۔ ان کا مقصدِ حیات تو دوامِ زیست ہے اور ان کا عشق حصولِ جنت کا متقاضی ہرگز نہیں ہے۔

یہی ہے آرزو میری دوامِ زندگی پاؤں
طلب فردوس و جنت کی تو اک رنگیں بہانہ ہے

(ص:۷۹)

وہ انسان کے مادیت پسند رویوں کی مذمت کرتی ہیں۔ انہیں اس امر سے شدید قلق پہنچتا ہے کہ عبد کا رشتہ معبود سے کمزور تر ہوتا جا رہا ہے کیونکہ انسان نے یومِ الست کے عہد کو فراموش کر دیا ہے اور خود کو دولت کا پجاری بنا دیا ہے۔

اللہ سے کسی کو محبت نہیں رہی
دولت سے ہو گئی ہے عقیدت نہ پوچھئے

(ص:۸۳)

خالقِ ارض و سما نے انہیں توکل و استغنا کی خصوصیات سے نوازا ہے۔ اس لیے وہ ہمیشہ صابر و شاکر رہتی ہیں۔ قناعت پسندی ان کا وصفِ خاص ہے۔ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہیں کیونکہ وہ صرف اللہ کی عبادت کرنے اور اسی سے مدد مانگنے کی قائل ہیں۔

آمادۂ الطاف و کرم ذات ہے اس کی

میں کس سے کہوں تنگیٔ داماں کا حکایات
اللہ سے بڑھ کر نہیں کوئی بھی ہمارا
ہے کوئی سہارا تو ہے اللہ کی اک ذات

(ص:۹۳)

خدا اور اس کے رسولؐ سے عقیدت و محبت کا والہانہ انداز ان کے ہاں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ یہی ان کے عشقِ حقیقی کا اعجاز ہے کہ ان کی غزل میں بھی حمدیہ اور نعتیہ اشعار ملتے ہیں۔ یوں ان کی غزل تقدس آشنا ہو جاتی ہے۔

شہنازؔ کی نہیں ہے کوئی اور آرزو
مولا درِ رسولؐ کی اس کو گدائی دے

(ص:۹۶)

انہیں اس امر کا پختہ یقین ہے کہ خدا کے دربار سے کوئی بھی سائل خالی نہیں جاتا۔ صرف شرط یہ ہے کہ انسان کو صدقِ دل سے محوِ دعا ہونے کا قرینہ میسر ہو۔

صدقِ دل سے جو کوئی محوِ دعا ہوتا ہے
جو بھی مانگے اسے فطرت سے عطا ہوتا ہے
کوئی فطرت کے تقاضوں کو بدل سکتا ہے
جس کا کوئی نہیں ہوتا ہے خدا ہوتا ہے

(ص:۱۰۰)

ان کے نزدیک عشقِ خداوندی کسی عبادت سے کم نہیں ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ اس لیے وہ اسے اپنا ایمان خیال کرتی ہیں۔ یہی ایک سچے صوفی اور سالک کی علامت ہوا کرتی ہے۔

ہم نے چاہت کو ہی شہنازؔ عبادت سمجھا
ہم نے چاہت ہی کو ایمان بنا رکھا ہے

(ص:۱۰۱)

انہیں عرفانِ وفا حاصل ہے جسے وہ قرینہء حیات گردانتی ہیں۔انسان کے اپنے رب سے کمزور تعلق پر وہ بنی نوع انسان کو ہدفِ تنقید بناتی ہیں۔اس لیے ان کے ہاں تنقیدی رویے بھی آشکار ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ گویا ہیں کہ انسان کے پاس زندگی کرنے کا قرینہ بھی نہیں ہے۔

پُر نورِ وفا سے ترا سینہ ہی نہیں ہے
حاصل تجھے جینے کا قرینہ ہی نہیں ہے
رفعت کے فلک پر ہو رسائی تری کیسے
نظروں میں تری فکر کا زینہ ہی نہیں ہے

(ص:۱۰۲)

جب کہ اس کے برعکس صورتِ حال کو انہوں نے کچھ یوں پیش کیا ہے۔

جب مری روح کے تاروں کو ہلاتا ہے کوئی
سرمدی گیت محبت کے سناتا ہے کوئی
میں خیالوں کو حقیقت ہی سمجھ لیتی ہوں
اس طرح آ کے مرے ناز اٹھاتا ہے کوئی

(ص:۱۰۳)

ان کے نزدیک خدائے بزرگ و برتر کی ذات ہمارے وہم و گمان سے بھی ماورا ہے۔ جہاں تک ہماری رسائی ممکن ہی نہیں ہے، اور نہ ہی ہمیں اس حوالے سے کچھ عرفان حاصل ہے کیونکہ شہناز مزمل کے نزدیک یہ ایک راز ہے اور جس کا پانا ممکن ہی نہیں ہے۔ان کے ہاں تصوف ایک بہت بڑا فلسفہ ہے جس کی وسعت کا اندازہ حیطہء امکاں میں نہیں ہے۔

یہ تیری ہستی تو بیکراں ہے
نہ خود کبھی اس کو پا سکیں گے
ہیں ہفت افلاک راستے میں

نہ اڑ کے بھی تجھ تک آ سکیں گے
پرے افق کے ہے کیسی وادی
خیال تک بھی نہ لا سکیں گے
یہ راز تو راز ہی رہے گا
یہ راز ہرگز نہ پا سکیں گے
یقیں نہیں ہے گماں نہیں ہے
کہاں ہے تو اور کہاں نہیں ہے

(ص:۱۰۴)

اب ہم شہناز مزمل کے تیسرے مجموعہء کلام "جذب وحروف" کی نسبت سے مذکورہ موضوع کے تناظر میں اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہیں۔

وہ خدائے لم یزل کی محبت کے علاوہ تمام تر دنیاوی محبتوں کو ہیچ سمجھتی ہیں اور عشقِ حقیقی کو اپنا سرمایہء حیات خیال کرتی ہیں۔ انہیں اس امر کا کوئی خوف نہیں ہے کہ ساری دنیا ناراض ہو جائے۔ انہیں تو بس یہی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ قربتِ یزداں میسر رہے اور وہ اسی پر فاخر و نازاں ہوتی رہیں۔

بے شک زمانہ مجھ سے گریزاں ہے آج کل
مجھ کو نصیب قربتِ یزداں ہے آج کل

(ص:۱۲۰)

عاجزی وانکساری ان کے عشق کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ اپنے آپ کو ادنیٰ اور حقیر و ناتواں مخلوق سمجھتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے الطاف واکرام کا اعتراف کرتی ہیں۔ ان کا عشق انہیں کو بہ کو، قریہ بہ قریہ اور یم بہ یم لیے پھرتا ہے کیونکہ وہ اپنے محبوبِ حقیقی سے ربطِ نہاں رکھتی ہیں۔

میں سزا وارِ کرم ہرگز نہ تھی ربِ کرم
جب نوازا تو نے تو پیرِ مغاں تک آ گئے

عشق میں تیرے تجھے ڈھونڈا کئے تھے چارسو
دیکھنے کو ہم تجھے ربطِ نہاں تک آ گئے

(ص:۱۲۲)

اب شہناز مزمل کے چوتھے مجموعہ کلام "عکسِ دیوار پہ تصویر" سے استشہادات واستخراجات پیش کی جاتی ہیں۔

ان کی فکر کا نکتہ ءکمال یہ ہے کہ وہ نہ صرف عشقِ نبوی ﷺ سے آراستہ ہیں بلکہ وہ مخلوقِ خدا سے بھی ہمدردی رکھتی ہیں اور ان کی یہی خیر خواہی امن وآشتی کی متمنی ہے۔ اسی موضوع کو انہوں نے کس خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔

آپؐ کی امت میں پھر تکرار ہے
کیا یہاں پھر کربلا ہونے کو ہے ؟

(ص:۱۴۱)

شہناز مزمل کے ہاں تصوف کا نظریہ "ہمہ اوست" اپنے پورے کروفر سے کارفرما ہے کیونکہ انہیں دنیا ومافیہا کی ہر چیز میں عکسِ باری تعالیٰ دکھائی دیتا ہے۔ کچھ اسی نوع کی مثال شعر ہذا میں بھی پیش کی گئی ہے۔

منسوب تیرے نام سے لَو اس کی میں کروں
روشن کہیں جو دُور چراغِ ھُدا بھی ہو

(ص:۱۴۸)

اب ہم ان کے شعری مجموعے "میرے خواب ادھورے ہیں" سے شعری استشہادات و استخراجات موضوعِ مذکور کے تناظر میں لائیں گے۔

ان کے کلام کا سب سے بڑا وصف وسعت اور ہمہ گیری ہے جو ان کی بالیدہ فکری کی علامت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ان کے ہاں معرفت ومجاز کی بیک وقت خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ذیل کے شعر میں بھی یہی کیفیت کارفرما ہے۔ شعر ہذا بحر ہزج مثمن سالم میں کہا گیا ہے

جس کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ہیں۔

زمانہ ساز نظروں سے وہ سب کچھ بھانپ لیتا ہے
مگر اپنے ارادوں کی خبر ہونے نہیں دیتا

(ص:۲۲۱)

شہناز مزمل کے فحوائے بیان میں تصوف کی قدیم اور جدید دونوں صورتیں پائی جاتی ہیں۔ کلاسیکی تصوف میں خدائے بزرگ و برتر کی ذات سے کسی نوع کے شکوہ و شکایت کی قطعاً گنجائش نہیں ہوتی کیونکہ عشقِ حقیقی کا کلاسیکی فلسفہ اس امر کی ہرگز اجازت نہیں دیتا جبکہ تصوف کی معاصر صورت میں شکوہ و شکایت اور طنز و تنقید کی تمام صورتیں روا ہیں۔ گویا یوں کہا جا سکتا ہے کہ جدید تصوف میں فزوں تر وسعت کا پہلو پایا جاتا ہے۔ اسی تناظر میں ان کے ذیل کے شعر کی مثال دی جا سکتی ہے۔

کوئی بھی حرفِ دعا اب اثر نہیں رکھتا
مرا خدا بھی تو مجھ پر نظر نہیں رکھتا

(ص:۲۲۸)

ان کا فلسفۂ عشق اپنی انتہاؤں کو پہنچا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ ایک درویش خدا مست سالک کی طرح اپنی مرادِ حقیقی کو پانے کا عزم بالجزم رکھتی ہیں۔ وہ راستے کی تمام تر کٹھنائیوں اور سنگینیوں کو خاطر میں نہیں لاتیں۔ وہ ہر حال میں جادۂ منزل پہ گامزن رہنے کی قائل ہیں۔

ظالم بن کر ظلم مٹایا جیت گئے
حق کی خاطر مات بھی کھائی جا سکتی تھی

(ص:۲۴۰)

اگر شہناز مزمل کے فن کے حوالے سے بات کی جائے تو ان کے ہاں شعری تلمیحات کا استخدام بھی عمدہ قرینے سے ہوا ہے۔ اسلوبیاتی اعتبار سے ان کے ہاں نوع بہ نوع لسانی تشکیلات اور عمدہ مرکبات کا التزام بھی قابلِ دید ہے۔

اب ہم ان کے شعری مجموعہ "عشق تماشا" کو مذکورہ موضوع کے پس منظر میں زیرِ تجزیہ لاتے ہیں۔

ان کے ہاں عشقِ حقیقی کا تمام تر فلسفہ اپنی مکمل جزئیات کے ساتھ کارگر ہے جس میں یومِ الست سے لے کر ساعتِ موجود تک کی جملہ کیفیات پائی جاتی ہیں۔ ان کے بیان کی خوب صورتی یہ ہے کہ ان کے ہاں بے تکلفی کا پہلو بھی بڑی عمدگی کے ساتھ پایا جاتا ہے جو ان کے گہرے اعتماد کی پختہ دلیل ہے۔ جستجوئے حق ان کا مرکزی موضوع ہے جس کی بازیافت کے حوالے سے "ہمہ اوست" کا فلسفہ ان کا معاون و مددگار رہے۔ ان کا عشق اس نوعیت کا ہے جو انہیں دنیا و ما فیہا سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے آپ اور معاصر سالکین کو جادۂ منزل پر مستقل مزاجی سے گامزن رہنے کی تلقین کرتی ہیں۔

مجھ کو زمیں پہ بھیج کے خود سے کیا جدا
تو ہی بتا دے کیسا رہا تیرا فیصلہ
آ کر زمیں پہ ڈھونڈتے پھرتے تھے ہم خدا
جھانکا تو اپنی ذات کے اندر چھپا ملا
عاشق تلاش، عشق میں حد سے گذر گیا
اور عقل نے گمان کو منزل بنا لیا
بس اک نقشِ پا پہ ہوئی خم جبینِ شوق
پھر اسکے بعد نقشِ تمنا مٹا دیا
عاشق یقیں کا ہاتھ میں تھامے گا جب دیا
مل جائے گا جواب اسے ہر سوال کا

(ص: ۲۶۴-۲۶۵)

شہناز مزمل نے اپنی شعریات میں اپنے وجود اور اپنی فکر کو سراپائے عشق کے طور پر پیش کرنے کی سعی مشکور کی ہے۔ اس سلسلے میں وہ کسی نہ کسی حد تک کامیاب و کامران بھی ہوئی ہیں۔

اسی حوالے سے ان کی ایک غزل کا مطلع اور ایک شعر ملاحظہ کریں جو بحر ہزج مسدس محذوف میں ہیں جن کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن فعولن ہیں۔

ہر اک منظر میں خود کو ڈھونڈتا ہے
ترا عاشق تماشا بن گیا ہے
نمازِ عشق قائم ہو گئی ہے
ترا عاشق مکمل ہو گیا ہے

(ص:۲۶۶)

وہ جہانِ آب وگل میں موجود عشقِ حقیقی کے حوالے سے تصورات کو زیرِ بحث لاتی ہیں اور ان میں پنہاں محاسن و معائب کو بھی طشت از بام کرتی ہیں جس سے نہ صرف ایک صوفی کو منزل کا ادراک ہوتا ہے اور سالکین کی معاونت ہوتی ہے۔ وہ اس راستہ میں موجود مصائب و آلام سے بھی آشنا ہوتے ہیں۔ وہ عشق کی لامحدودیت کی قائل ہیں۔ وہ اسے پابندِ زمان ومکان نہیں سمجھتیں۔ وہ محب ومحبوب کسی سے کسی نوع کی زیادتی کی روادار نہیں ہیں کیونکہ بسا اوقات وہ عشق میں اذیت پسندی کی قائل نہیں ہوتیں جسے تصوف کا جدید فلسفہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یوں ان کا فلسفہء عشق پوتر اور پرسکون محسوس ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی ایک غزل کے تین اشعار ملاحظہ ہوں جو بحر رمل مثمن محذوف میں ہیں جن کا عروضی وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہے۔

ایک اندھا راستہ عاشق کو دکھلایا گیا
عشق ہست و بود ہے ناداں کو سمجھایا گیا
عشق پابندِ سلاسل ہے نہ پابندِ مکاں
بے وجہ دیوار میں عاشق چنوایا گیا
عشق سے ناراض ہوں معشوق سے بھی ہوں خفا
مجھ سا عاشق وعدۂ فردا پہ ٹرخایا گیا

(ص:۲۶۷-۲۶۸)

ان کی ایک اور غزل جسے سراپا معرفت کہا جا سکتا ہے، جو تصوف سے معمور ہے اور ماقبل بحر و وزن میں کہی گئی ہے، ہم اسے بدونِ تجزیہ نذرِ قارئین کرتے ہیں اور اس کا تبصرہ ہم قارئین کی صوابدید پر چھوڑتے ہیں۔ دیدہ باید کہ وہ اس حوالے سے کیا رائے قائم کرتے ہیں۔

کون کہتا ہے کہ مجھ سے دور کوہِ طور ہے
نور ہے تیرا نظر میں دل میں تو مستور ہے
ڈھونڈنا تجھ کو نہیں مشکل مرے دل کے مکیں
تو رگوں میں دوڑتا ہے چشمِ تر کا نور ہے
مان لوں میں کس طرح کہ کچھ بدل سکتا نہیں
تیرے ہی تو ہاتھ کا لکھا ہوا منشور ہے
میں ہوں تیری تو ہے میرا ساری دنیا کو بتا
بعد اس کے جو بھی ہو گا فیصلہ منظور ہے
دل میں تو سوچوں میں تو چاروں طرف بس تو ہی تو
ساتھ تیرے جو نہ گذرے وہ شبِ دیجور ہے

(ص:۲۶۹)

شہناز مزمل کی شعریات میں تصوف کی جمالیاتی اقدار اپنی پوری آب و تاب سے کارفرما ہیں۔ ان کے نزدیک تمام کمالات کی مقتدر محبوبِ حقیقی کی ذات ہے جس کا ادراک انسانی ذہن کے بس کی بات نہیں ہے۔ قلب و خرد جہانِ شعر کے دو ایسے موضوع ہیں جنہیں کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ قلب کو خاص طور پر عشق کے استعارے کے طور پر بروئے کار لایا جاتا ہے جسے قلب کا اختصاصی استخدام گردانا جا سکتا ہے۔ عشق میں قلب کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور پھر یہ خود سراپا عشق بن جاتا ہے۔ گویا عشق میں سب سے اہم کردار ع قلب کا ہی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیائے عشق میں اہلِ دل کامیاب و کامران ٹھہرتے ہیں جبکہ اہلِ خرد کے مقدر میں ہمیشہ ناکامی و نامرادی آتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ عقل کو جدائی کی اذیت ناک ساعتیں

میسر آتی ہیں۔ جبکہ دل عشق کے کیفِ وصال میں محو و منہمک رہتا ہے۔ مذکورہ استخراجات سے یہ حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے کہ عشق قلب و خرد دونوں کے لیے ذریعہء استراحت بھی ہے۔ اسی تناظر میں ان کی ایک غزل کا مطلع اور ایک شعر لائقِ التفات ہیں جو بحر خفیف مسدس سالم مخبون محذوف میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان فاعلاتن مفاعلن فعلن ہیں۔ بحر ہذا کے سب ارکان ہلکے ہوتے ہیں۔ دو سبب خفیف و تد مجموع کو گھیرے ہوتے ہیں، اس لیے بحر کا نام خفیف رکھا گیا ہے۔ اس بحر کو متاخرین شعرائے فارسی اور شعرائے اردو نے سوائے مسدس مزاحف کے کسی اور طرح استعمال نہیں کیا۔ اس بحر کے تمام اجزا سالم مستعمل نہیں ہیں مگر صدر و ابتدا سالم بھی استعمال میں آتے ہیں۔

دل تو اس کے جمال میں گم ہے
سائیں سوہنا کمال میں گم ہے
عقل کو لمحہء فراق ملا
عشق کیفِ وصال میں گم ہے

(ص: ۲۷۳)

ان کے تصوف میں ایک محویت و استغراق کا عالم پایا جاتا ہے۔ ایک خود سپردگی اور از خود رفتگی کی فضا ہے۔ جنوں آمیز کیفیات ہیں۔ ایک بے خودی ہے جو اپنی انتہاؤں کو چھو رہی ہے۔ جس سے ان کے نفسیاتی و حسیاتی اور فلسفیانہ اعماق و آفاق کے ابواب وا ہوتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ گویا ان کے ہاں عشق میں اپنی ذات کی نفی یعنی فنافی النفس کی نوعیت بھی ہے۔ یہ تمام تر ادراکات و امور قاری کو حیرت و استعجاب میں گرفتار کرنے کے لیے کافی و شافی ہیں۔ یوں ان کے کلام کی مقبولیت و دلپذیری دوچند ہو جاتی ہے۔

عجب ہے عشق کہ پہچان بھی نہیں اپنی
کچھ اور ہو گی ترے انتخاب کی صورت

(ص: ۲۷۴)

یومِ الست میں جب خدائے بزرگ و برتر نے تمام ارواح کو مجتمع کیا تھا، تو خالقِ ارض وسما نے تمام روحوں سے استفسار کیا تھا کہ کیا مجھے تم اپنا رب تسلیم کرتے ہو؟ کیا میرے بتائے ہوئے طریقے پر زندگی گزارو گے؟ تو اس پر تمام ارواح نے متفق ہو کر بیک زبان اقرار کیا تھا۔ انسان کی روح جسے روحِ جز کہا جاتا ہے، اور روحِ ایزدی کو روحِ کل سے موسوم کیا جاتا ہے، اصل میں روحِ جز کا اضطراب روحِ کل سے علیحدگی یا جدا ہونے کے باعث ہوا ہے کیونکہ یہ ایک مسلمہ و مصدقہ حقیقت ہے کہ ہر چیز اپنی اصل کی طرف مراجعت کرتی ہے۔ یہی منطقی سبب ہے کہ حضرتِ انسان اپنی آفرینشِ حیات سے ہی روحِ کل کی تلاش میں ہے اور اسی جستجو کو عشق کا حسیں استعارہ ودیعت کیا گیا ہے۔

روزِ ازل سے عشق کی مجھ کو تلاش تھی
جب سر جھکایا تو مجھے بندگی ملی

(ص:۲۷۵)

شہناز مزمل عشق کے منطقی و استخراجی نتائج سے بخوبی آشنا ہیں۔ یہ ایک مبینہ حقیقت ہے کہ اضطراب عشق کا ایک مبادی تلازمہ ہے لیکن انسانی نفسیات کا کچھ عجیب ہی فلسفہ ہے۔ یعنی جو عشق سے دوچار ہوا اور جو عشق سے محفوظ و مامون رہا، دونوں محوِ اضطراب ہیں لیکن یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ پہلی کیفیت دوسری کیفیت سے ہر حال میں بہتر ہے۔ راہِ عشق میں چاہے جتنے بھی مصائب و آلام ہوں، بہر حال یہ قابلِ صد احترام ہے۔ ان کے ہاں عشق کے حوالے سے مشکلات کا مذکور بھی ملتا ہے جس کا مقصد قاری کو پریشان و مضطرب کرنا ہرگز نہیں ہے بلکہ مقصود و منتہا ترسیلِ ادراک و شعور ہے۔ اسی نسبت سے ان کی ایک غزل کے دو اشعار زیبِ قرطاس ہیں جو بحر ہزج مسدس محذوف میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن فعولن ہیں۔

بہت آرام تھا خاموشیوں میں
تماشا عشق نے بنوا دیا ہے
کسی معصوم خواہش نے جکڑ کر

زمانے بھر میں رسوا کر دیا ہے

(ص:۲۷۷)

اب ہم شہناز مزمل کی کلیاتِ غزل "منتہائے عشق" مطبوعہ جنوری ۲۰۱۹ء میں شامل ان کے شعری مجموعے "بعد تیرے" کو موضوعِ ماقبل کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔

اگر ان کی حمد نگاری کے حوالے سے بات کی جائے تو یہ کہنا بجا ہوگا کہ ان کی حمد تصوف کے درجے فنا فی اللہ سے عبارت ہے اور ان کی نعت فنا فی الرسول سے موسوم ہے۔ گویا ان کا تمام تر حمدیہ و نعتیہ کلام معرفت آمیز سخن سے مملو ہے۔

ان کا عشق سوز و گداز کا حامل بھی ہے جس کا سپہ سالار حضرتِ قلب ہے اور عشق کے تمام تر معاملات میں خرد کو کسی نوع کا رسوخ حاصل نہیں ہے۔ بقول اقبالؒ:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

ان کا عشق ایسا ہے کہ جو خود میں ایک بے خودی کا پہلو لیے ہوئے ہے جو دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہے۔ جو صرف جذب و شوق اور کیف و مستی سے آشنا ہے۔ جہانِ عشق میں دولتِ ضبط کو خصوصی اہمیت حاصل ہوتی ہے جس کے بغیر حصولِ منزل کا خواب تشنۂ تعبیر رہ جاتا ہے۔ ضبطِ عشق کا وہ اثاثہ ہے جس کے باعث رازداری کا پہلو برقرار رہتا ہے۔ اس لیے دنیائے عشق میں خود کو سنبھالنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔ اس کارِ فرہاد کے لیے ناگزیر ہے کہ ایک صوفی یا سالک کے حواس مضبوط و مستحکم ہوں۔ نمازِ عشق کا بھرم محبوبِ حقیقی کے پیہم درشن کی بدولت ہی قائم رہتا ہے۔ ایک درویش خدا مست عاشق کے معاملات کو صحیح معنوں میں پاسدارِ عشق ہی سمجھ سکتا ہے۔ راہِ عشق میں رازداری کو خصوصی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے اس حوالے سے کسی سے بھی راز و نیاز کی باتیں نہیں کی جاسکتیں۔

عشق میں آگے بڑھے اور بڑھا سوز و گداز
عقل کی اب تو سنائی نہیں دیتی آواز

ہوش آتا ہی نہیں ہے ترے دیوانے کو
جذب کا کیف کا مستی کا عجب ہے انداز
آج تک خود کو سنبھالا ہے بڑی مشکل سے
کھول دے نہ دلِ مدہوش کہیں عشق کے راز
بن پلک جھپکے تجھے بیٹھ کر پہروں دیکھوں
میرے سجدے ہوں مجسم مری قائم ہو نماز
کوئی سمجھا ہے نہ سمجھے گا مری بات یہاں
تو ہی بتلا دے بھلا کس سے کروں راز و نیاز؟

(ص:۳۲۲)

اگر شہناز مزمل کے فنِ غزل کے حوالے سے بات کی جائے تو ان کے ہاں ہر نوع کی غزل عمدہ معیارات کی حامل ہے جن میں مردف غزل بھی ہے اور غیر مردف غزل بھی ہے۔ مزید برآں مسلسل غزل بھی ہے اور غیر مسلسل غزل بھی ہے جس سے ان کی غزل کی ریاضت کا اندازہ بطریقِ احسن لگایا جاسکتا ہے۔

اب ذرا ان کی نعتِ مبارکہ میں فنافی الرسول کے فلسفے کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

نہاں تھی محبت عیاں ہو رہی ہے
مری دھڑکنوں میں اذاں ہو رہی ہے
تہجد کے گریہ میں شامل ہوا بھی
مرے عشق کی رازداں ہو رہی ہے
میں چپ چاپ نظریں جھکائے کھڑی ہوں
خموشی مری اب زباں ہو رہی ہے
پکارے ہے دھڑکن محمدؐ محمدؐ
حدیثِ محبت بیاں ہو رہی ہے

میں عاشق ہوں دیوانگی بڑھ کے حد سے
مرے عشق کا امتحاں ہو رہی ہے
سراپاء اقدس دکھا نیم شب میں
یہ فرقت تو سنگِ گراں ہو رہی ہے
وہ شامل ہیں دھڑکن میں سانسوں میں خوں میں
عبادت یہاں سے وہاں ہو رہی ہے

(ص:۳۲۳-۳۲۴)

ان کا عشق سعیِ پیہم کے آدرش سے عبارت ہے۔ان کی یہی جانکاری اپنے قارئین کے لیے بھی ہے۔اصل میں کسی بھی شعبہء حیات کے ارتقا کا راز اسی امر میں مضمر ہے گویا ان کا یہ سندیس خرد آموزی اور جنوں خیزی سے مربوط بھی ہے کیونکہ عمل ہی اصلِ حیات ہے اور جمود علامتِ مرگ ہے۔

عشق تکمیل کی حد کو بھی چھو لے شاید
کرچیاں جوڑ کے اک عکس بناتے رہنا

(ص:۳۳۳)

حسن وعشق کے معاملات میں کسی نہ کسی حد تک مماثلت ومطابقت کے پہلو پائے جاتے ہیں جس طرح حسن کبھی لاکھ پردوں میں محصور ہوتا ہے تو کبھی جلوہ گری پر بھی آمادہ ہوتا ہے۔بعینہٖ معاملہ عشق کا بھی ہے۔شہناز مزمل کے تخیل کا نکتہء کمال یہ ہے کہ کبھی کبھی تجریدی آرٹ کی ردا اوڑھ لیتا ہے۔اسی پس منظر میں ان کی غزل کا ایک مطلع ملاحظہ کریں جو بحر ہزج مثمن سالم میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ہیں۔

چھپے ہو سات پردوں میں تمہیں تصویر کرنا ہے
ہمیں تو آج اپنے عشق کی تشہیر کرنا ہے

(ص:۳۶۲)

جب کسی بھی انسان کا عشق اپنی حقیقی معراج کو پہنچتا ہے تو پھر اس کا موقف کچھ اس طرح کا رنگ اختیار کرتا ہے جسے عشق کے ارتقا سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

تمام عمر کا بس صرف یہ ہی حاصل ہے
خدا ہے میرے لیے اور میں خدا کے لیے

(ص:۳۶۴)

شہناز مزمل عشق کے حوالے سے سماجی رویوں کو بھی زیرِ بحث لاتی ہیں اور اس تناظر میں بسا اوقات طنز و تنقید کا رویہ بھی اختیار کر لیتی ہیں۔ اسی نسبت سے ان کے ہاں بہت سے استفسارات پائے جاتے ہیں جن کے باعث ان کے سخن کا نفسیاتی و حسیاتی اور فلسفیانہ گراف بلند ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یوں ان کے ہاں شدتِ احساس اور زورِ بیاں کے تلازمات بھی نمو پذیر ہوتے ہیں۔

کیا محوِ تماشا کو دعا دے نہیں سکتے
اس عشق کی کیا اس کو جزا دے نہیں سکتے
راضی بہ رضا ہو کے ذرا پوچھنا چاہوں
عاشق کو محبت کی ردا دے نہیں سکتے

(ص:۳۶۵)

وہ سماج میں مادیت پسند رویوں کی مذمت کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک دنیا محض فریبِ آرزو ہے جو سراسر ظاہر پر مبنی ہے اور خدا کی ذات جو نظروں سے اوجھل ہے، صرف وہی قابلِ یقین ہے۔ ان کے ہاں گویا داخل و خارج کا ایک تقابلی مطالعہ کارفرما ہے۔

فریبِ آرزو دنیا ہے ساری
جو اوجھل ہے وہی میرا خدا ہے

(ص:۳۷۷)

ان کے نزدیک عشق ایک ایسی مسافت ہے جس میں خود ہی گرنا ہوتا ہے اور خود ہ سنبھلنا ہوتا ہے کیونکہ بظاہر اسے بے یار و مددگار رہ کر منزلِ مقصود پر پہنچنا ہوتا ہے۔

عشق سمندر ڈوبنے والے عشق کو
کوہ کن بھی تو آپ ہی بننا پڑتا ہے

(ص:۴۰۶)

عاجزی و انکساری اور فقیری عشق کا طرۂ امتیاز ہوا کرتی ہے کیونکہ عشق دنیا کے تمام تر تکلفات سے مبرا و ماورا ہوتا ہے۔

راس آ گئی مجھے بھی فقیری کی زندگی
اس عشق نے کہیں بھی نکلنے نہیں دیا

(ص:۴۰۶)

اب ہم ان کی کلیاتِ غزل "منتہائے عشق" میں موجود شعری مجموعہ "عشق سمندر" سے منتخب شعری استشہادات برائے استخراجات لاتے ہیں۔

ان کی ایک غزل ملاحظہ فرمائیں جس میں عشقِ خدا اور عشقِ مصطفیٰ ﷺ کو واضح انداز میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ غزل ہذا بحر متقارب مثمن سالم میں کہی گئی ہے جس کے عروضی ارکان فعولن فعولن فعولن فعولن ہیں۔

میں کیسے بتاؤں کہ کیا دیکھتی ہوں
تصور میں صلِ علیٰ دیکھتی ہوں
مجھے اُن کی رحمت صدا دے رہی ہے
محمدؐ کے دَر کو کھلا دیکھتی ہوں
کروں بند کیسے میں آنکھوں کو اپنی
حرم پاک میں، مَیں خدا دیکھتی ہوں
یہ ماہِ مقدس ہے جھولی کو بھرلوں
خدا کی میں جود و سخا دیکھتی ہوں
اِس اُمت کو اُن کی شفاعت عطا ہو

محمدؐ کے لب پر دُعا دیکھتی ہوں

(ص:۴۲۰)

ان کے نزدیک عشقِ مسلسل کو چاہت کا نام نہیں دیا جا سکتا بلکہ اسے ریاضت وعبادت کا مقام حاصل ہے۔گویا ان کا عشق عین عبادت ہے جسے کارِ بندگی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

مسلسل عشق میں میں مبتلا ہوں
ریاضت ہے یہ چاہت تو نہیں ہے

(ص:۴۲۲)

شہناز مزمل عشق کو باعثِ کیف وسرور گردانتی ہیں اور انہیں عشق نے وہ مدہوشی عطا کی ہے کہ وہ نہیں جانتیں کہ دنیاوی جام وسبو کیا ہے۔یہ بات ان کے ذاتی حوالے سے بھی ہوسکتی ہے اور اسے حدیثِ دیگراں کے طور پر بھی لیا جا سکتا ہے۔بحر ہزج مثمن سالم میں کہا گیا ان کی غزل کا یہ شعر لائقِ توجہ ہے:

بہت مدہوش رکھتا ہے یہ تیرے عشق کا نشہ
ترا عاشق یہ کب جانے ہے کہ جام وسبو کیا ہے؟

(ص:۴۶۴)

وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔اس لیے اگر انہیں دائیں بازو کی شاعرہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ وہ صرف خدا کی ہی ذات پر یقین رکھتی ہیں۔صرف اسی کی ہی عبادت کرتی ہیں اور فقط اسی سے ہی مدد چاہتی ہیں۔

کھڑی ہوں عشق مندر کے میں کنارے پر
سفینہ موجوں سے باہر وہی اُچھالے گا
سفر پہ عشق کے نکلے ہیں ہم خموشی سے
یقیں اپنے لیے راستہ بنا لے گا

(ص:۴۶۵)

ان کے عشق کا نکتہ ءکمال یہ ہے کہ اس میں متضاد و متنوع کیفیات پائی جاتی ہیں یعنی اس میں گہرائی و گیرائی کا فلسفہ کارفرما ہے۔ان کے عشقیہ موضوعات کی جانکاری کے لیے عشق کی نفسیات کی تفہیم ناگزیر ہے۔

وفورِ عشق میں سب کچھ بھلا کے ساکت ہیں
جنون و شوق کو تو مرگِ ناگہاں نہ سمجھ

(ص:۴۶۶)

عشق اگرچہ ایک طویل اور کٹھن مسافت ہے جسے عمرِ خضر درکار ہوتی ہے مگر کوئی ساعتِ سعید ایسی بھی آسکتی ہے جو اسے مقامِ تکمیل پر پہنچا دے۔اسی پس منظر میں ان کی غزل کا ایک شعر نذرِ قارئین ہے جو بحر رمل مثمن محذوف میں کہا گیا ہے۔جس کا عروضی وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہے۔

مدتوں سے میں بھٹکتی تھی تلاشِ یار میں
عشق کو میرے مکمل ایک لمحہ کر گیا

(ص:۴۶۷)

اگر غزل کے فنی معروضات کے حوالے سے بات کی جائے تو ان کے ہاں ایک پختگی کا عنصر پایا جاتا ہے اور ہر طرح کے مشکل و آسان قوافی اور ردیفوں کو نبھانے کی شہناز مزمل یکساں قدرت رکھتی ہیں۔

راہِ عشق ایک ایسی مسافت ہے جہاں انسان دنیا اور اہلِ دنیا کو بہت پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ دنیاوی تعلق نبھانا انسان کے لیے محض ایک قصہ ءپارینہ بن جاتا ہے جسے اس لیے دشواری کا نام دیا جاسکتا ہے کیونکہ دنیاوی تعلق ایک سالک کی ترجیحات سے خارج ہوجاتا ہے۔

عشق میں ہم تو بہت دور نکل آئے ہیں
ہم سے اب کوئی تعلق ہے نبھانا مشکل

(ص:۴۶۹)

عشق ایک ایسی منزل ہے جو انسان کو تمام تر سنگینیوں اور کٹھنائیوں سے آشنا کر دیتی ہے اور ہر نوع کی مشکلات کا خوف بھی ختم کر دیتی ہے۔ اسی نوع کا اظہار شہناز مزمل کے ہاں بھی ملتا ہے۔ شعر ہذا بحرِ خفیف مسدس سالم مخبون محذوف میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان فاعلاتن مفاعلن فعلن ہیں۔

عشق منزل کے ہم مسافر ہیں
سب مصائب کو جانتے ہیں ہم

(ص:۴۷۱)

اب ہم شہناز مزمل کی کلیاتِ غزل "منتہائے عشق" میں شامل ان کے دسویں شعری مجموعہ "عشق مسافت" میں سے منتخب شعری استشہادات زیرِ تجزیہ لاتے ہیں۔ ان کے نزدیک عشق ایک پوتر جذبہ ہے۔ اگر اس پر انسان کامل یقین رکھتا ہو تو وہ اس امر کا پورا پورا ادراک حاصل کر لیتا ہے کہ یہ ایک عبادت ہے۔ ماقبل بحر و وزن میں کہا گیا ان کی غزل کا ایک اور شعر دیکھیے۔

گر یقین ہے تمہارا کامل تو
عشق کرنا بھی اک عبادت ہے

(ص:۴۹۷)

وہ اپنے عشق کے توسط سے نئے نئے فلسفے تخلیق کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔ ان کے نزدیک جیسے سونا آگ میں جل جل کر کندن ہو جاتا ہے، یہی معاملہ عشق میں انسان کا بھی ہے۔

عشق سمندر ڈوب کے مٹی کتنی ہے زرخیز ہوئی
پھل اور پھول پھوٹے ہیں اس میں بیج یہ کیسا بویا ہے
؟

(ص:۵۰۸)

عشق کے حوالے سے جتنے ادراکات پائے جاتے ہیں، ان میں سے اکثر و بیشتر کا احاطہ کرنے کی انہوں نے سعی بلیغ کی ہے۔ اس لیے ہم یہ بات بلاخوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ ان کے

ہاں عشق کے حوالے سے جتنی جانکاری ملتی ہے، وہ بہت ہی کم سخنوروں کے ہاں پائی جاتی ہے جس میں عشق کا کیف وسرور بھی ہے اور عشق کے حوالے سے مصائب اور آلام کا مذکور بھی ہے۔ وہ اپنے قاری کو عشق کی مبادیات سے مکمل آشنا کرنا چاہتی ہیں۔

ہم عشق کے سفر پر نکل آئے تو منزل
پیچھے دھکیلتی ہے رسائی نہیں دیتی

(ص:۵۱۵)

شہناز مزمل عشق میں خرد کی مکمل نفی کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا بلکہ خرد عشق کے تابع ہو جایا کرتی ہے۔ اسے ان کے جنوں کا طاقتور حوالہ تو قرار دیا جا سکتا ہے مگر یہ خرد کی نسبت سے ایک کمزور ترین پہلو ہے۔

ہے زعم بہت عقل پہ ان دیدہ وروں کو
ان کو تو بابِ عشق پڑھا کیوں نہیں دیتی؟

(ص:۵۱۶)

اب ہم ان کی کلیاتِ غزل "منتہائے عشق" میں موجود گیارہویں اور آخری مجموعہ کلام "عشقِ مسلسل" کی نسبت سے اپنے موضوعِ مذکور کو آگے بڑھاتے ہیں۔

ان کے ہاں عشق کے حوالے سے ایک بے تکلفی کی فضا ملتی ہے جو ان کے گہرے اعتماد کی علامت ہے۔ گویا ان کے فحوائے شعر میں عشقیہ موضوعات کے حوالے سے مکمل رواداری کا پہلو پایا جاتا ہے جسے ان کی فکری وسعت اور وسیع تر قوتِ متخیلہ کی مبینہ دلیل کہا جا سکتا ہے۔

عشق کی دیکھی جلوہ آرائی
میں تماشا ہوں وہ تماشائی

(ص:۵۶۵)

وہ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ عشق اپنے اندر کشف و کرامات کی دولت بھی رکھتا ہے کیونکہ راہِ عشق پر چلنے کی بصارت سے بہت سے پردے اٹھا دیے جاتے ہیں۔ پھر وہ اہلِ بصیرت

اور دیدہ ور بن جاتے ہیں۔ یہ دیدہ وری صرف عشق ہی کی بدولت ممکن ہے۔

دعا کے فیض کے اسرار مجھ پہ کھلتے گئے
دیارِ عشق کے رستے کو اختیار کیا

(ص:۵۵۹)

عشق ایک ایسا مسلک ہے جہاں اہلِ عشق کی جانچ اور پرکھ روا نہیں ہوتی نہ ہی ان پر طنز و تنقید کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس حوالے سے ان کے ہاں صنعتِ تلمیح کا حامل ایک شعر دیکھیے۔

نہ پرکھو عشقِ اویس قرنی
صحابیء بے مثال سمجھو

(ص:۵۷۳)

جذبہء عشق کس قدر راز داری کا حامل ہوتا ہے، ان کی ذیل کی غزل میں ملاحظہ کیجئے جو بیک وقت مسلسل بھی ہے اور غیر مسلسل بھی ہے۔ یعنی اگر دور کی کوڑیاں ملائی جائیں تو مسلسل ہے اور اگر نزدیک کی کوڑیاں ملائی جائیں تو غیر مسلسل ہے۔

ہم عشق کو اپنے کبھی رسوا نہیں کرتے
عاشق ہیں مگر عشق تماشا نہیں کرتے
شہدا کبھی مرتے نہیں یہ سب کو بتا دو
جو زندہ ان کے لیے رویا نہیں کرتے
سجدے میں سر کٹایا تھا معشوق کے لیے
عاشق تو اپنے عشق کا سودا نہیں کرتے
کربل تو اصل میں ہے محبت کی انتہا
چپ چاپ جاں سے جاتے ہیں چرچا نہیں کرتے
عاشق کو نہیں چاہیے یہ دولتِ دنیا

بیکار اثاثوں کو سنبھالا نہیں کرتے

(ص:۵۹۸)

شہناز مزمل کے نزدیک عشق ایک ایسا جذبہ ہے جو تخیل و تدبیر اور زبان و بیان سے ماورا ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ عشق ان تمام تر خصوصیات سے تہی ہونے کے باوجود بھی یہ تمام اوصاف خود میں سموئے ہوئے ہوتا ہے۔ مگر اس کے ادراک کے لیے نفسیاتِ عشق کی تفہیم کا ہونا بھی ناگزیر ہے کیونکہ عشق کے معاملات میں عمومیت نہیں بلکہ اختصاصیت و ندرت ہوتی ہے۔

تخیل تدبیر نہیں عشق میں
نہیں عشق کی کوئی ہوتی زباں

(ص:۶۰۵)

شہناز مزمل کے معرفت آمیز سخن کے فکری و فنی گوشوں کی سیر حاصل غواصی کے بعد یہ حقیقت اظہر من الشمس ہوتی ہے کہ ان کا کلام فکری کمالات کا حاصل ہے۔ اگرچہ ان سے اکثر و بیشتر مقامات پر عروضی تلازمات کا استخدام پورے وثوق سے نہیں ہو پایا مگر ہمیں یہ امر ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے کہ ہر سخن ور میں کچھ نہ کچھ مسائل ضرور ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی نوعیت ذرا مختلف بھی ہو سکتی ہے۔

باب ششم

ڈاکٹر شہناز مزمل کی شاعری اور فکری بیداری

شعر شعور سے ماخوذ ہے۔ اس لیے اس کی اصطلاحی تعریف میں قصد اور ارادہ شامل ہے۔ شعور ہی کی معطقیت سے فکری بیداری کی نمو پذیری ہوتی ہے، اسے ذہنی ارتقا کے لیے کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ حضرتِ انسان کو اس لیے اشرف المخلوقات کے شرف سے مشرف کیا گیا ہے کیونکہ اسے عقلِ سلیم کی دولت ودیعت کی گئی ہے۔ تعلیمِ سخن میں اس شاعری کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی جو قارئین کے شعوری ارتقا میں اہم کردار ادا نہیں کر سکتی۔ اگر ادب کے دونوں نظریوں یعنی ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے تو فکری بیداری دونوں نظریات کی مبادیات میں شامل ہے۔

شذرہ ہذا میں ہم شہناز مزمل کے کلام کا تجزیہ فکری بیداری کے تناظر میں کریں گے۔ اس سلسلے میں ہم ان کی کلیاتِ غزل "منتہائے عشق" مطبوعہ جنوری ۲۰۱۹ء میں شامل اولیں شعری مجموعے "پیامِ نو" سے شعری استشہادات برائے استخراجات لائیں گے۔ بین التحریر ہماری کوشش رہے گی کہ جملہ انتقادی تناظرات بروئے کار لائے جائیں اور تحقیق و تنقید کے کلی تاثر کو اجاگر کیا جائے۔

ان کی سخن سازی صرف نظریہءشعر گفتن برائے شعر ہرگز نہیں ہے بلکہ وہ نظریہءادب برائے ادب اور نظریہءادب برائے زندگی دونوں کو متوازن انداز میں ساتھ لے کر چلتی ہیں۔ اس لیے سماجی حوالوں سے بھی ان کا کلام وسیع تر افادی پہلو رکھتا ہے۔ وہ اجتماعی شعور کا احیا اور تجدیدِ نو

چاہتی ہیں۔اس لیے وہ ایک کلی زاویہءفکر رکھتی ہیں۔سماج سدھار کی سوچ ان کے ہاں واضح اور نمایاں انداز میں چلتی ہے۔یہ الگ بات ہے کہ ان کا رجحان ومیلان مادیت کی بجائے روحانیت کی طرف زیادہ ہے کیونکہ یہی ایک حقیقت ہے جس کی بدولت جذبے پوتر ہوتے ہیں اور روح کو بالیدگی میسر آتی ہے جس میں تذکیہءنفس اور تطہیرِ ذات کے پہلو بھی پائے جاتے ہیں۔ان کے فحوائے شعر میں نظری وعملی شواہد یکساں سہولت کے ساتھ کارگر ہیں اور وہ اپنے قاری کو دیدۂ بینا کے طور پر دیکھنا چاہتی ہیں۔وہ اپنے کلام کے توسط سے ترسیلِ ادراک وشعور کا کام لینا جانتی ہیں۔

مرا پیام مری قوم کی امانت ہے
مرا پیام مری روح کی ریاضت ہے
مرے پیام میں شامل ہے میرا فکر وعمل
مرا پیام تمہارے لیے بصارت ہے

(ص:۱۸)

فکری بیداری کی جو روایت علامہ اقبال سے شروع ہوئی تھی، شہناز مزمل نے اس حسیں روایت کے تسلسل کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اس میں جدت پیدا کرنے کی سعیِ بلیغ بھی کی ہے۔ اقبال کی طرح انہوں نے بنی نوع انسان کی کردار سازی میں بھی اہم کردار ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔مزید برآں یہ کہ عبد ومعبود کے رشتے کو بھی قوی تر کرنے کی عمدہ کاوش کی ہے۔انہوں نے اپنی شعریات کی بدولت تعیّشاتِ حیات اور زندگی کی عدم مقصدیت کو مسترد کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ان کی سخنوری میں لایعنیت نہیں ہے بلکہ اعلیٰ وارفع مقصدیت کو فروغ حاصل ہے۔ انہوں نے اقبال کی طرح انسان کی خودی کے تشخص کو تواتر سے اجاگر کرنے کی سعی جمیل کی ہے۔ ایک دائیں بازو کی شاعرہ ہونے کے ناتے ان کا مذہب کی طرف رجحان غالب ہے۔

پڑے تھے راہ میں کتنے ہی پیالہ و ساغر
یہ زندگی مے و مینا کو روند آئی ہے
خودی کو بھول کے تو خدا کو بھول گیا

اسی لیے تو عدو سے بھی منہ کی کھائی ہے
اے لامکاں کے مکیں میری آرزو ہے یہی
ملے وہ راہ جہاں تیری راہ نمائی ہے

(ص:۱۹)

اگر فکری بیداری کے پس منظر میں ان کے فحوائے بیاں کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے تو ان کے ہاں زیست کا دائرۂ کار وسیع تر ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے جس میں مثالیت بھی ہے اور آفاقیت بھی ہے۔ ترقی پسندی کے پہلو بہ پہلو انسان دوستی کا جزوِ لاینفک بھی موجود ہے جہاں امن و آشتی کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اقبال کی طرح وہ بنی نوعِ انسان کی کردار سازی پر خصوصی توجہ دیتی ہیں۔ اس لیے ان کے ہاں تربیتی خصائص کی بہار سامانی بھی موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام تاثیرات کی دولت سے مالا مال ہے۔ تمام تر آشوب زدگیوں کے باوجود بھی وہ آگے بڑھنے کا عزمِ صمیم رکھتی ہیں۔ وہ روحانیت میں مکمل انہماک و استغراق کی قائل ہیں کیونکہ اگر یہ کیفیت حاصل نہ ہو تو دعائیں بھی بے اثر اور ریاضتیں بے ثمر ہوتی ہیں۔ فکری بیداری کا یہی آدرش ان کے قارئین کے لیے بھی ہے۔

کیوں قیدِ زیست میں تیرا وجود ہے محبوس؟
کہیں سے کوئی پیامِ سحر نہیں آتا
کیوں رنگ لاتی نہیں اب یہ گرمیٔ گفتار؟
کیوں تیرے شعر و سخن میں اثر نہیں آتا؟
کٹھن سفر ہے تو منزل بھی دور ہے اپنی
کہیں پہ سایہ شجر کا نظر نہیں آتا
جو اس جہاں کی حقیقت کو فاش کر ڈالے
چمن میں ایسا کوئی دیدہ ور نہیں آتا
جو لوگ جاں کو ہتھیلی پہ دھر کے پھرتے ہیں

کیا اُن کو اس کے علاوہ ہنر نہیں آتا؟
نہیں خشوع و خضوع آج تیرے سجدوں میں
اسی لئے تو دعا میں اثر نہیں آتا

(ص:۲۳-۲۴)

شہناز مزمل کے شعری کینوس میں سعیِ پیہم کا سندیس تواتر و تسلسل کے پیرائے میں ملتا ہے کیونکہ وہ اس کی اہمیت سے بخوبی آشنا ہیں۔ بقول راقم:

عیاں یہ زمانے کی تصویر میں ہے
تعلق سا اک سعی و تقدیر میں ہے

ان کی طبیعت میں توکل اور استغنا اور قناعت پسندی کے خصائص پائے جاتے ہیں۔ وہ دنیا کے ہر نوع کے لوبھ اور لالچ سے مبرا و ماورا ہیں۔ وہ انسان کے ضمیر کو جھنجھوڑنے اور اس کے حواس کو مستعد کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان کے ہاں بے لوث جذبوں کا وفور ملتا ہے۔ اس لیے ہر قسم کے تصنعات و تکلفات ان سے گریزاں نظر آتے ہیں۔ ان تمام امور کے باعث ان کی فکری بیداری میں فزوں تر تحریک پیدا ہو جاتی ہے۔

گر ہے جمود طاری تمنا بھی چھوڑ دے
بہتر ہے اب تو خواہشِ دنیا بھی چھوڑ دے
اس دو رُخی تلاش میں دنیا ملے نہ دیں
گر ہو سکے تو خواہشِ بے جا بھی چھوڑ دے
بے لوث کاوشوں کا صلہ مانگتی نہیں
دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے
جو کچھ تیرے نصیب میں تھا تجھ کو مل گیا
جو مل سکا نہ اُسکا تقاضا بھی چھوڑ دے

(ص:۲۵-۲۶)

ان کا کلام سستی و کاہلی، عدم مقصدیت اور لایعنیت کے خلاف ایک صدائے خاراشگاف کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ انسان کو عرفانِ ذات کا حسین پیغام دیتی ہیں۔ کیونکہ خودی کی پہچان انسان کی اولین ترجیح ہونی چاہیے۔ انہوں نے اپنے فحوائے بیان میں جرأتوں اور جسارتوں کی نئی داستان رقم کی ہے۔ قومی حمیت کی بیداری کے حوالے سے بھی ان کے ہاں وسیع تر ادراکات پائے جاتے ہیں۔ ان کی فکر میں قارئین کے لیے ہمت و حوصلے کی ترغیب ملتی ہے۔ وہ فکر کی بالیدگی اور کردار کی پختگی و سنجیدگی کی قائل ہیں۔ ان کی شاعری میں عظمتِ انسان کے حوالے سے فزوں تر امکانات پائے جاتے ہیں۔ بحر ہزج مثمن سالم میں کہے گئے ان کی غزل کے چار اشعار ہدیہء قارئین ہیں جن کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ہیں۔

تو ہے مومن تیری ہمت سے ہر پتھر پگھلتا ہے
کچھ ایسی شان سے رستے کا ہر پتھر ہٹانا ہے
اگر ڈالے نظر ٹیڑھی کوئی تیرے نشیمن پر
تو ہے دہقان خرمن خود تجھے اپنا بچانا ہے
تری ہمت زمانے کو عزیمت کیش ہے اب بھی
تو ہے دیوار سیسے کی جہاں کو یہ دکھانا ہے
تو خود بیں ہے خودی سے اپنی ہو آگاہ اے بندے
خودی کا یہ نیا پیغام دنیا کو سنانا ہے

(ص: ۲۷)

بحرِ حرص و ہوس کا کوئی کنارہ بھی نہیں ہے۔ اس کی وسعتیں لامتناہی ہیں۔ لوبھ اور لالچ ایسے خصائص ہیں جو حواسِ انسانی پر مستولی ہو جاتے ہیں اور انسان تمام مثبت اقدار سے گریزاں نظر آتا ہے۔ اس کی بصیرت کی بساط لپٹ جاتی ہے۔ نیک و بد کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے اور مروتیں روپوش ہو جایا کرتی ہیں۔ یوں خود احتسابی کا عمل مفقود ہو جاتا ہے۔ پھر تمام معائب کا منبع دوسروں کی ذات نظر آتی ہے۔ اخلاقی روایات معدوم ہو جاتی ہیں۔ مصلحت اندیشی اور زمانہ شناسی

کے اوصاف معدوم ہو جاتے ہیں۔ یہ تمام امور انسان کو نا آسودگی سے دو چار کر دیتے ہیں۔ بعینہٖ معاملہ ذوقِ جنوں کا بھی ہے جو انسان کو بے کل اور بے چین کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ انسان اپنی ذات سے اعراض برتنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

حرص و ہوس کے آگے نہ کچھ بھی دکھائی دے
انسان اپنے قد سے بھی چھوٹا دکھائی دے
اپنے دلوں کا کھوٹ کوئی عیب تو نہیں
سکہ پرایا ہو تو وہ کھوٹا دکھائی دے
کوئی تو ایسا شخص دکھاؤ ذرا مجھے
انسانیت کا بوجھ جو ڈھوتا دکھائی دے
لہروں کے گر مزاج کو سمجھے نہ ناخدا
ساحل پہ ہی سفینہ ڈبوتا دکھائی دے
ذوقِ جنوں میں خود کو فراموش کر دیا
شہناؔز کو آرام نہ ہوتا دکھائی دے

(ص:۲۸-۲۹)

عصری بے حسی کے منطقی نتیجے میں جن سماجی مسائل کو فروغ میسر آیا ہے، وہ ان کی بیخ کنی چاہتی ہیں۔ اس لیے ان کے ہاں مکارمِ اخلاق کی تعلیم بالواسطہ اور براہِ راست دونوں انداز میں پائی جاتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ طنز و تنقید کا رویہ بھی اختیار کرتی ہیں۔ یوں ان کے کلام کی تاثیرات میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان کی فکریات کے بنظرِ غائر مطالعہ سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ وہ ایک مثالی دنیا کی خواہاں ہیں۔ ان کے ہاں مثالیت و آفاقیت کے خصائص پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔

قدر شناس جہاں میں کہیں نہیں ملتے
شمار اپنوں کا کرتے ہیں بد خواہوں میں

یہی جو امن کی صورت رہی زمانے میں
تلاش سانپ کریں گے پناہ گاہوں میں

(ص:۳۰)

شہناز مزمل ایک حساس دل انسان ہیں۔ اس لیے انسانی کج روی اور بے راہروی پر ان کا دل کڑھتا ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ انسان مشیت کے اصولوں پر کاربند رہے۔ یہ دنیا جو حق و باطل کا ایک خونچکاں معرکہ ہے، وہ حق کی داعی اور علمبردار ہیں۔ وہ بدی کے فروغ کو شیطان کی اطاعت و عقیدت قرار دیتی ہیں اور یوں وہ انسانی ذہن کو بیدار کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ان کے اشعار میں استفہامیہ اشارات کا استخدام ان کے زورِ بیاں اور شدتِ احساس کا مظہر ہے۔ اس پس منظر میں ذیل کا شعر ملاحظہ فرمائیں۔

کیسے بتائیں حضرتِ انساں کا ماجرا؟
شیطاں سے ہو گئی ہے عقیدت نہ پوچھیے

(ص:۳۱)

وہ معاملاتِ عالم پر محوِ غور و فکر رہنے کو عبادت قرار دیتی ہیں۔ اس لیے وہ عصری تقاضوں سے ہم آہنگ دکھائی دیتی ہیں۔ ان کا نکتہ نظر صرف نظری نہیں بلکہ عملی بھی ہے۔ وہ آہ و فغاں کی بجائے عمل کو ترجیح دیتی ہیں۔

جہاں پہ غور کروں یہ مری عبادت ہے
نقیبِ وقت ہوں لیکن فغاں شعار نہیں

(ص:۳۳)

جہاں ان کے ہاں اجتماعی ادراکات کارفرما ہیں، وہاں ان کے ہاں عرفانِ ذات کا پہلو بھی اپنے پورے کروفر سے پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خوددار اور خودبیں قرار دیتی ہیں۔ انہیں یہ بھی ادراک ہے کہ ان کی ہستی بے ثباتی کی حامل ہے۔ ان کے ہاں فکری بیداری کا پہلو سماجی حوالے

سے بھی ملتا ہے۔ انہیں علم وحکمت کی روایات کے معدوم ہونے کا دلی قلق ہے۔ اس لیے وہ گویا ہیں کہ ہمارے ہاں صرف تنگیٔ داماں کی حکایت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اوران روایات کو سننے کی کسی میں بھی سکت نہیں ہے۔ بسا اوقات ان کی فکر استفہامیہ رنگ اختیار کر جاتی ہے۔ اس لیے وہ مشیت کو بھی ہدفِ تنقید بناتی ہیں۔ یوں وہ انسان کو دعوتِ فکر وعمل دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

خودداری و خود بینی کا پرتو ہے میری ذات
یہ جانتی ہوں ہستی ہے میری بھی بے ثبات
حکمت کا اور علم کا ملتا نہیں سراغ
کیا سن سکے گا تنگیٔ داماں کی حکایات
ہرذرے کو پابند سلاسل بنا دیا
کیا اس لئے ہی کی بتا تخلیق کائنات
لے چشمِ بینا ساتھ اور دُنیا کھنگال ڈال
تا حدِ نظر پھیلے ہیں قدرت کے انعامات

(ص:۳۴-۳۵)

شہناز مزمل انسان کو اپنی عظمتِ رفتہ کی یاد دلاتی ہیں اور یوں دعوتِ عمل دیتی ہیں۔ وہ انسان کے اندر ایک خود اعتمادی اور عزم وحوصلے کی فضا دیکھنا چاہتی ہیں۔ اس حوالے سے ان کی غزل کا ایک مطلع ملاحظہ کریں جو بحر رمل مثمن محذوف میں ہے جس کے عروضی ارکان فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہیں۔

تیرا ماضی ہی بنا جو دعوتِ تعمیر ہے
کرلے بازو پر بھروسا منتظرِ تقدیر ہے

(ص:۳۸)

وہ دنیا میں حق و باطل کی قوتوں کو برسرِ پیکار دیکھتی ہیں۔ وہ خیر کی قوتوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں اور شر کی قوتوں کی بھرپور انداز میں مذمت کرتی ہیں۔ یوں فکری بیداری کا ایک اہم

فریضہ ادا کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

ذرا ابلیس کو تھوڑا سا سبق سکھلا دیں
اس نے سارے زمانے کو نچا رکھا ہے

(ص:۴۱)

وہ اپنے قارئین میں تحریک پیدا کرنے کے لیے اظہار کے مختلف طریقہ ہائے کار سے کام لیتی ہیں۔اس لیے ان کے پیغام میں عمیق حسیاتی ونفسیاتی اور فلسفیانہ تاثر پایا جاتا ہے۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عمل ہی زیست کی اصل اساس ہے۔

جہانِ نو میں جہاں اور کتنے پنہاں ہیں؟
تلاش کرتا رہ جب تک کہ تجھ میں دم خم ہے

(ص:۴۳)

فکری بیداری کے تناظر میں ہم ان کی ایک پوری غزل بدونِ تجزیہ شاملِ شذرہ کر رہے ہیں جس کا تبصرہ ہم قارئین کی صوابدید پر چھوڑتے ہیں۔دیدہ باید کہ وہ اس حوالے سے کیا رائے قائم کرتے ہیں۔

چاند تاروں کی ضیا تو نے کبھی دیکھی ہے
بند کلیوں کی قبا تو نے کبھی دیکھی ہے
رُخ مہوش پہ ہو پُر نور تقدس کا حصار
پاک مریمؑ سی حیا تو نے کبھی دیکھی ہے
ہوں گے معلوم تجھے پیرِ کہن کے غمزے
کیسے ملتی ہے بقا تو نے کبھی دیکھی ہے
تشنہ لب رند بھی مدہوش ہوئے جاتے ہیں
ایسی مستانہ ادا تو نے کبھی دیکھی ہے
ہو گا واقف تو ہر ایک جزا سے لیکن

بے ضمیری کی سزا تو نے کبھی دیکھی ہے
عقل عیار ہے جلوے نئے دکھلاتی ہے
نازؔ ایسی بھی فضا تو نے کبھی دیکھی ہے

(ص:۴۴)

شہنازؔ مزمل نئی نسل کے مستقبل کے حوالے سے متفکر نظر آتی ہیں اور ان کی نسبت سے استدعائیہ اندازِ فکر اختیار کرتی ہیں۔ وہ خدائے بزرگ و برتر سے ایسے جنوں کی عطا کے لیے دعا گو ہیں جو خرد کی ساحری کو خضرِ راہ بنانے کی استعداد رکھتا ہو، وہ نسلِ نو کی حمیت و خودداری کا احیا چاہتی ہیں۔

الٰہی بخش جوانوں کو تو جنوں ایسا
خرد کی ساحری کو خضرِ راہ بنا دے تو
نہ باقی ان کی حمیّت نہ ان کی خود داری
خودی کو بھول چکے ہیں خودی جگا دے تو

(ص:۴۵)

مذکورہ بالا استشہادات و استخراجات سے یہ حقیقت اپنے پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ فکری بیداری کے تناظر میں ان کا کلام علوئے فکر کا حامل ہے اور انہوں نے اسلوب ایسا شفاف اور شستہ اختیار کیا ہے کہ ہر ذہنی سطح کا قاری اکتسابِ فیض کر سکتا ہے۔ مگر فنی حوالے سے ابھی انہیں ریاضتِ بسیار درکار ہے۔ اگر ان کی کشیدِ جاں کا یہی تسلسل جاری و ساری رہا تو نئے فنی امکانات کی بازیادت کا عمل ان کے لیے مزید سہل تر ہو جائے گا۔

باب ہفتم

ڈاکٹر شہناز مزمل کا نظریہء ادب برائے زندگی

ادب کے بتدریج ارتقا میں بہت سے عوامل کا کردار کلیدی نوعیت کا حامل ہوتا ہے جن کا احصا تصنیف ہذا میں ممکن نہیں ہے البتہ اس حوالے سے ادبی تحاریک اور ادبی نظریوں کی معاونت مثالی رہی ہے۔ ویسے تو ادب کے حوالے سے مختلف نظریات پائے جاتے ہیں لیکن ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے نظریے اختصاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ساعتِ موجود میں اہلِ ادب تین بڑے گروہوں میں منقسم ہو چکے ہیں۔ پہلا گروہ ایسا ہے جو نظریہء ادب برائے ادب کا حامی ہے اور کلاسیکی ادب کا گہرا ادراک رکھتا ہے۔ یہ ایسے اربابِ قلم ہیں جن کا فنی اور لسانی پہلو بہت زیادہ استعداد کا حامل ہے۔ ادب کی روایت کے اعتبار سے نظم و نثر کا گہرا شعور رکھتا ہے۔ انہیں نہ صرف فن کی مبادیات پر دسترس حاصل ہے بلکہ وہ علمِ بیان یعنی صنائع و بدائع اور موزونیت کے علم، علم العروض سے وسیع تر آشنائی حاصل ہے۔ ان کے ہاں ادب آموزی کے وسیع تر امکانات پائے جاتے ہیں۔ ان کے برعکس دوسرا گروہ ایسا ہے جو مذکورہ بالا خصائص کا مکمل پاسدار نہیں ہے۔ فنی اور لسانی استعداد کم تر ہونے کے باعث وہ نظریہ ادب برائے زندگی کا قائل ہے اور وہ ادب کے افادی و سماجی پہلو کا زیادہ حامی ہے۔ اس سب کے برعکس تیسرا گروہ ایسا ہے جو دونوں نظریوں کو متوازن انداز میں ساتھ لے کر چلنے کا قائل ہے۔ ہمارے خیال میں یہ ایسے اربابِ فکر نظر ہیں جنہیں سب سے زیادہ معتبر کہا جا سکتا ہے۔ یعنی ان کے ہاں کسی نوع کی افراط و تفریط نہیں ہے۔ ان کے ہاں ادب آموزی یعنی نظریہ ادب برائے ادب اور ادب کا افادی پہلو یعنی نظریہ

ادب برائے زندگی بھی ہے۔

نظریہء ادب برائے زندگی کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ یہ وسیع تر عمرانی پہلوؤں کا حامل ہے۔شذرہ ہذا میں ہم لاہور میں مقیم معروف شاعرہ شہناز مزمل کے سخن کا تجزیہ نظریہء ادب برائے زندگی کے تناظر میں کریں گے۔اس سلسلے میں ان کی کلیاتِ غزل "منتہائے عشق" ہمارے روبرو ہے۔اس نسبت سے کلیاتِ مذکور میں موجود ان کے تین مجموعہ ہائے کلام "جرأتِ اظہار"، "جذب وحرف" اور "عکسِ دیوار پر تصویر" سے منتخب شعری استشہادات برائے استخراجات پیش کریں گے۔ مگر مذکورہ مجموعہ ہائے شعر کی ترتیب کو ملحوظِ خاطر ضرور رکھا جائے گا۔سب سے پہلے ہم اس کلیات میں موجود دوسرے مجموعہ کلام "جرأتِ اظہار" کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔

شہناز مزمل مبادیاتِ حیات اور مقتضیاتِ حیات کا مکمل ادراک رکھتی ہیں۔وہ ادب کے افادی پہلو کی سختی سے قائل ہیں جس کا بنیادی سبب ان کی وسیع تر انسان دوستی کا پہلو بھی ہے۔کیونکہ وہ انسانیت کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہیں۔اصل میں ان کے نزدیک یہی شعارِ زندگی ہے۔بقول الطاف حسین حالی:

یہی ہے عبادت، یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

فلاحِ انسانیت کا جذبہ ان کے خمیر میں گندھا ہوا ہے۔یہ تربیت انہیں دینِ متین ہی سے میسر آئی ہے کیونکہ اس حوالے سے ارشادِ خداوندی ہے کہ انسانوں میں بہتر وہی ہے جو دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔بحر ہزج مثمن سالم میں کہا گیا ان کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو جس کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ہیں۔

کروں میں خدمتِ انسانیت توفیق دے مجھ میں
کسی کے کام آؤں ہو یہی کوشش سدا میری

(ص:۶۱)

وہ اپنی زندگی کے لیے نئے راستے متعین کرتی ہیں کیونکہ بنی بنائی ڈگر پر چلنا انہیں گوارا نہیں

ہے۔شاید اس کی بنیادی وجہ ان کی طبعی ندرت ہے۔یہی جانکاری ان کی اپنی قارئین کے لیے بھی ہے۔

زیست کو اک نیا انداز دیا ہے میں نے
میں نے ہر شام نئی صبح کا چہرہ دیکھا

(ص:۶۴)

ان کے ہاں ملی وقومی جذبات وفور سے پائے جاتے ہیں۔ان کی فکر میں ایک ہمہ گیری ہے جوخود میں مثالیت وآفاقیت کے خصائص بھی رکھتی ہے۔ان کا کلام وسیع تر تجربات ومشاہدات کا حامل بھی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے خیالات میں ایک بالیدگی کا عنصر نمایاں ہے۔وہ بحیثیت ایک مصلح اپنی قوم کی تربیت کا کٹھن فریضہ انجام دیتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔انہوں نے اپنے حاصلِ مطالعہ میں قوموں کو روبہ زوال بھی دیکھا ہے اور قوموں کو بنتے سنورتے بھی دیکھا ہے۔گویا ان کے ہاں ایک عمیق تہذیبی وتاریخی شعور پایا جاتا ہے۔

وہی اقوام نظر آتی ہیں اب بھی محکوم
اپنی تہذیب سے جن جن کو معرا دیکھا

(ص:۶۴)

شہناز مزمل کے نزدیک جدوجہد اور سعیِ پیہم ہی اصل میں رمزِ زندگانی ہیں۔تگ وتازِ حیات ہی انسان کی کامیابی وکامرانی کی نوید ہوا کرتا ہے۔اپنے شعری بیانیے کو وقیع اور تمثیلاتی رنگ دینے کے لیے وہ مظاہرِ فطرت کا وسیع تر استخدام کرتی ہیں۔یوں ان کا کلام فطری رچاؤ سے ہم آہنگ ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔اسی فطری پن کے باعث ان کی شاعری پر آمد کا گماں ہوتا ہے جس کے باعث ان کے سخن کی مقبولیت وپذیرائی میں اضافہ ہوا ہے۔

ساحل کا یہ سکوت ہے پیغام موت کا
پیغامِ زندگانی ہے موجوں کو اضطراب

(ص:۶۸)

تمام دانشوروں اور مفکروں نے اپنے اپنے مکتبِ فکر کے مطابق زندگی کی تعریف متعین کرنے کی سعی مندوب کی ہے جس میں وہ کسی نہ کسی حد تک کامیاب و کامران بھی ہوئے ہیں۔ فطری طور پر ہر انسان آرام پسند اور سکون طلب ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر کسی کا پر امن زندگی کا خواب پورا ہو۔ انہوں نے اس حوالے سے زندگی کی کچھ یوں تعریف متعین کی ہے۔ اس حوالے سے ان کا ایک فرد ملاحظہ کریں جو بحر خفیف مسدس سالم مخبون محذوف میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان فاعلاتن فاعلاتن فعلن ہیں۔

زندگی میں سکوں ارے توبہ
زندگی اک حسین دھوکا ہے

(ص:۶۹)

زیست کے کسی بھی شعبے میں عاجزی وانکساری کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ عجز و انکسار ہی کامیابی کی نوید ہوا کرتا ہے۔ اس حوالے سے قولِ زریں بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عظمت و رفعت عاجزی وانکساری میں رکھی ہے مگر لوگ اسے غرور اور تکبر میں تلاش کرتے ہیں۔ بقول شاعر:

جو اعلیٰ ظرف ہوتے ہیں ہمیشہ جھک کے ملتے ہیں
صراحی سرنگوں ہو کر بھرا کرتی ہے پیمانہ

بقول کسے:

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

اسی موقف کو شہناز مزمل نے اپنے منفرد انداز میں کچھ یوں پیش کیا ہے۔ شعر ہذا بحر ہزج مثمن سالم میں کہا گیا ہے جس کا عروضی وزن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ہے۔

مقامِ زندگی ملتا ہے اس کو بامِ رفعت پر

ودیعت جس کو فطرت سے طبیعت عاجزانہ ہے

(ص:۷۹)

وہ اپنی قوتِ متخیلہ اور شعری وجدان کے بل بوتے پر بڑے بڑے فلسفے تخلیق کرنے کی قدرت رکھتی ہیں۔ وہ تلخ حقائق کا عمیق ادراک رکھتی ہیں اور ان کی مصلحت و منطقیت کو بخوبی سمجھتی ہیں۔ وہ زیست میں ان کی اہمیت سے آشنا ہیں۔

دل کی سچائیاں گو تلخ نظر آتی ہیں
زندگی میں مگر رنگ تو بھر جاتی ہیں

(ص:۸۰)

وہ خلوص و مروت کو مقتضیاتِ حیات میں شمار کرتی ہیں۔ اس لیے وہ عصری کج روی سے نالاں دکھائی دیتی ہیں۔ اس حوالے سے ان کے ہاں استفہامیہ اشارات پائے جاتے ہیں جو ان کے حسیاتی و نفسیاتی اور فلسفیانہ عمق کی نشاندہی کرتے ہیں۔ وہ گویا ہیں کہ دنیا سے اخلاص و ایثار کی بساط کیوں لپیٹ دی گئی ہے؟ پیار کی دولت کس طرح تباہ و برباد ہوئی؟ معاملہ ہذا ناگفتنی ہے کیونکہ خلوص ناپید ہو چکا ہے اور شرافت منہ ڈھانپے فریاد کناں ہے۔ اب کے صورتِ حال یہ ہے کہ بازارِ حرص و ہوس گرم ہو چکا ہے۔ بقول راقم:

ہوس نے بنائی ہیں سب داستانیں
اسی راہ میں لوگ پاگل ہوئے ہیں

خلوص کی قدر و قیمت باقی نہیں رہی۔ ہمارے سماج پر خودغرضی اور مفاد پرستی کا تسلط ہے۔ ذرا ان حوالوں سے شہناز مزمل کا موقف بھی دیکھیے۔

دینا کے دل سے رنگِ مروت کہاں گیا
کیوں لٹ گئی ہے پیار کی دولت نہ پوچھئے
ملتا نہیں خلوص کسی کی نگاہ میں
کیوں منہ چھپا رہی ہے شرافت نہ پوچھئے

بازارِ حرص میں ہے طلب جنسِ حرص کی
کم ہو گئی خلوص کی قیمت نہ پوچھئے

(ص:۸۳-۸۷)

وہ حیات کی کٹھنائیوں سے بخوبی واقف ہیں۔انہیں اس امر کا ادراک حاصل ہے کہ کہ زیست مصائب وآلام سے عبارت ہوا کرتی ہے۔زندہ رہنے کے لیے بہت سی مشکلات جھیلنا پڑتی ہیں۔اگر جذب ومحبت سے دل محروم ہوتو نگاہ کو بالیدگی میسر نہیں ہوتی۔ان کے نظریہءادب برائے زندگی میں معقولیت ومعروضیت اور منطقیت پائی جاتی ہے۔

نہیں نہیں میری منزل ابھی نہیں آئی
ابھی نصیب میں باقی ہے بادہ پیمائی
ابھی ہے جذب و محبت سے میرا دل محروم
ابھی نگاہ نے بالیدگی نہیں پائی

(ص:۸۷)

ساعتِ موجود میں انسان کا سب سے بڑا مسئلہ شدید نوعیت کا احساسِ تنہائی ہے کیونکہ انسان خودغرضی کے حصار میں مقید ہو چکا ہے۔مفاد پرستی نے اسے سماجی اقدار وروایات سے محروم کر دیا ہے۔انسان کے دکھ درد کا مداوا اس کے ساتھ کے انسانوں کے پاس ہے۔اگر انسانوں کے پاس اس کے لیے کچھ وقت نہ ہوتو وہ مصائب میں گرفتار رہتا ہے۔

مصیبتیں ہیں بہت زندگی کی راہوں میں
چھپا لے کاش کوئی مجھ کو اپنی بانہوں میں

(ص:۹۲)

شہناز مزمل کا اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے تاریخِ انسانی سے اکتسابِ فیض کیا ہے اور وہ اقدار وروایات کی سختی سے قائل ہیں۔اسلاف اور پرکھوں کا ادب واحترام ان کا وطیرۂ حیات ہے اور جو قوم بزرگوں کو فراموش کر دیتی ہے،تاریخ اسے نیست ونابود کر دیتی ہے۔

ذلت کے سوا کچھ بھی انہیں ہاتھ نہ آیا
شہناز جو بھولے ہیں بزرگوں کی روایات

(ص:۹۳)

وہ زیست کے فلسفے کی پیچیدگیوں سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ اس امر سے آشنا ہیں کہ جس کے جذبوں اور کردار میں حدت ہو، زندگی کے مصائب وآلام اس سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ پھر حزن وملال سے اسے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ یہی رمزِ حیات ہے۔ یہی اصلِ زندگانی ہے۔

گرمیء جذبہ کردار ہو جس کو حاصل
غم کی زنجیر سے وہ شخص رہا ہوتا ہے

(ص:۱۰۰)

اب ہم شہناز مزمل کی کلیاتِ غزل "منتہائے عشق" میں سے ان کے تیسرے مجموعہء کلام "جذب وحروف" سے شعری استشہادات برائے استخراجات موضوعِ مذکور کی نسبت سے لاتے ہیں۔

وہ اپنے قاری کے حوالے سے تعلیم وتربیت کا اہم فریضہ سرانجام دیتی ہیں۔ اس لیے ان کے پاس مناسب رہنمائی اور حوصلہ افزائی کا پہلو بھی کارفرما ہے۔ وہ کامیاب زندگی گزارنے کے لیے تیزی اور مستعدی کو ناگزیر خیال کرتی ہیں کیونکہ ان کے نزدیک پریشان ومضطرب رہنا کوئی مسائل کا حل نہیں ہے۔

نہ دل گرفتہ ہو رفتار اپنی ٹھیک بھی کر
کچھ اور تیز تو چل وقتِ زندگی کم ہے

(ص:۱۱۰)

اگر ان کی فکریات کا بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو وہ خرد کی بجائے قلب کی طرف زیادہ جھکاؤ رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا زیادہ تر کلام داخلی اظہار کا حامل ہے اور داخلیت کو ان کے ہاں وفور حاصل ہے۔ ان کے کلام میں خرد آموزی کی بجائے جنوں خیزی کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ وہ

زندگی میں جدوجہد اور تسلسل کی قائل ہیں۔ اسی پسِ منظر میں ان کی غزل کے تین اشعار ملاحظہ کریں جو بحر خفیف مسدس سالم مخبون محذوف میں کہے گئے ہیں جن کا عروضی وزن فاعلاتن مفاعلن فعلن ہے۔

سوئی خواہش کو جاگنے دینا
دل پہ پہرے نہ تم بٹھا رکھنا
بھید دل کا نہ کھول دیں آنکھیں
چلمنوں کو ذرا گرا رکھنا
زندگی نام ہے تسلسل کا
منزلوں تک یہ سلسلہ رکھنا

(ص:۱۱۱-۱۱۲)

شہناز مزمل کے نظریہ ادب برائے زندگی میں تنقیدی رویے اور انتقادی شعور وفور کا حامل ہے کیونکہ وہ زندگی کی قدر و قیمت سے بخوبی آشنا ہیں اور وقت کی اہمیت کو جانتی ہیں۔ کیونکہ جو لمحے رائیگانی کی نذر ہو گئے ہیں، انہیں زیست کا حاصل شمار کرنا ماسوائے حماقت کے کچھ نہیں ہے۔

گزر گئے ہیں بہت لمحے رائیگاں اپنے
تم ان کو زیست کا حاصل شمار کرتے ہو

(ص:۱۱۷)

ان کے شعری کینوس میں طربیہ احساس بھی وفور سے ملتا ہے۔ وہ مستقبل سے پرامید دکھائی دیتی ہیں۔ اس سے وہ اپنے قاری کو زندگی کا ایک صحت منداور خوش گوار تاثر دینے میں کامیاب ہو جاتی ہیں جو پرامن زیست کا تصور قرار پاتا ہے۔

ظلمت شبِ سیاہ نے اپنی سمیٹ لی
شمعِ حیات پھر سے فروزاں ہے آج کل

(ص:۱۲۱)

حیات تجربات و مشاہدات کا حاصل ہوا کرتی ہے ۔مصائب و آلام آموزشِ زیست میں اہم کردار ادا کرتے ہیں ۔ یوں ذہنی ارتقا کا سفر جاری وساری رہتا ہے ۔ بحر رمل مثمن محذوف میں کہا گیا ان کی غزل کا ایک مطلع لائقِ توجہ ہے جس کے عروضی ارکان فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہیں ۔

جو نہاں دل میں تھے افسانے زباں تک آ گئے
زخم کھا کے زندگی سے ہم کہاں تک آ گئے

(ص:۱۲۲)

اب ہم ان کے چوتھے مجموعہء کلام "عکسِ دیوار پر تصویر" کی نسبت سے بات کو آگے بڑھاتے ہیں ۔

اگر فنی حوالے سے بات کی جائے تو وہ ہر نوع کے قوافی اور ردیفوں کا استخدام یکساں قدرت سے کرتی ہیں ۔مختصر بحور میں عمدہ اشعار نکالنا ان کا کمالِ فن ہے ۔فکری حوالے سے ان کا سخن حیات و کائنات کے تلازمات پر محیط ہے ۔ان کے احساسات وسعتوں کے حامل ہیں ۔زندگی اور موت کے حوالوں سے ان کی فکریات میں ایک بالیدگی کا عنصر پایا جاتا ہے ۔بحر خفیف مسدس سالم مخبون محذوف میں کہے گئے ان کی ایک غزل کے دو اشعار لائقِ توجہ ہیں جن کا عروضی وزن فاعلاتن مفاعلن فعلن ہے ۔

زندگی کا حصار مشکل ہے
موت کا انتظار مشکل ہے
لاش اپنی اٹھا کے کندھوں پر
ہم سفر بار بار مشکل ہے

(ص:۱۳۹)

ان کے ہاں عزم و حوصلے کی نوید ملتی ہے کیونکہ زندگی کے مصائب و آلام اسی کے باعث فرو ہوتے ہیں ۔اگر ہمت و حوصلہ معدوم ہو تو زیست کا سفر مشکل ہو جایا کرتا ہے ۔ان کے فحوائے بیان

میں ایک طربیہ اور رجائی تاثر پایا جاتا ہے جس سے خوشگوار جذبات و احساسات جنم لیتے ہیں۔

تھا جواں عزم تو دشوار کوئی راہ نہ تھی
اب تو دشوار یہ جیون کا سفر لگتا ہے
راہ تاریک ہے منزل کا نشاں دُھندلا ہے
کرمکِ شب بھی مسافر کو خضر لگتا ہے

(ص:۱۴۳)

وہ نئی منزلوں کی تلاش و جستجو میں رہتی ہیں۔ وہ مشکلات سے خوفزدہ نہیں ہوتیں۔ ان کی فکر میں ایک جدت و ندرت کا پہلو کارگر ہے۔ گویا وہ زندگی کرنے کے ہنر سے مکمل طور پر آشنا ہیں۔

راہوں کے پیچ و خم میں گزاری ہے زندگی
منزل کوئی نئی بھی دکھا دیجئے مجھے

(ص:۱۴۷)

مذکورہ استخراجات سے یہ حقیقت پایہ تیقن کو پہنچتی ہے کہ شہناز مزمل کے ہاں نظریہ ادب برائے زندگی کا تصور انتہائی تندرست و توانا نوعیت کا حامل ہے۔ ان کی شعریات میں عمرانی و سماجی حوالوں سے بہت سے افادی پہلو پائے جاتے ہیں جو قارئین کے لیے اکتسابِ فیض کا سامان رکھتے ہیں۔ ان کا اسلوب ہر ذہنی سطح کے قاری کے لیے یکساں مفید ہے۔ گویا ان کے سخن میں ایک وسیع تر ابلاغیت پائی جاتی ہے جو ان کے کلام کی مقبولیت و پذیرائی میں اہم کردار ادا کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ امید ہے کہ فردائی ادوار میں بھی ان کا کلام مقبول اور ہر دل عزیز رہے گا کیونکہ ان کی شاعری اس امر کا استحقاق رکھتی ہے کہ اسے پڑھا جائے اور سراہا جائے۔

باب ہشتم

ڈاکٹر شہناز مزمل کا سخن عصری بے حسی کے حوالے سے

عصرِ حاضر میں اخلاقی اقدار و روایات روبہ زوال ہیں۔ اخلاص و مروت کی بجائے خود غرضی اور مفاد پرستی کو فروغ حاصل ہے۔ انسانی زندگی میکانیت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ انسانیت اور روحانیت کا صرف تصور ہی باقی ہے۔ عملی شواہد معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ ان معاملات کا اثر جہاں انسانی رویوں پر ہوا ہے، وہاں ادب بھی ان سے ناگزیر طور پر متاثر ہوا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اخلاقی قدروں کا احیا کیا جائے اور انسانیت سے مملو جذبوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

شہناز مزمل ایک کثیر الجہات شاعرہ ہیں۔ ان کے ہاں متضاد و متنوع موضوعات پائے جاتے ہیں۔ جذبات و احساسات کی ایک گنگا جمنی فضا پائی جاتی ہے۔ دیگر پہلوؤں کے پہلو بہ پہلو عصری بے حسی کا تاثر بھی بڑی شدت سے پایا جاتا ہے جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ دائیں بازو کی شاعرہ ہیں۔ مذہبی رجحانات و میلانات کو ان کے ہاں بڑی فوقیت حاصل ہے۔ شذرہ ہذا میں ہم ان کے کلام کا تجزیہ عصری بے حسی کے تناظر میں کریں گے۔ اس حوالے سے ہم ان کی کلیاتِ غزل "منتہائے عشق" مطبوعہ جنوری ۲۰۱۹ء میں موجود ان کے ساتویں مجموعہء کلام "عشق تماشا" سے منتخب شعری استشہادات برائے استخراجات لائی گے۔

انہوں نے اپنی شعر گوئی کے توسط سے روحِ عصر رقم کرنے کی عمدہ کوشش کی ہے کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ سماجیات کی شعر و ادب میں کیا اہمیت ہے۔ ان کے کلام میں سماجی رویوں کی جھلکی

بڑے نمایاں انداز میں مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔ وہ اپنی شاعری کے توسط سے براہِ راست اور بلاواسطہ طور پر مکارمِ اخلاق کا احیا چاہتی ہیں کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ ہماری معاشرت میں نفرتوں کی عمل داری ہے اور زندگی وحشت ناک صورت اختیار کر چکی ہے۔ خیر و شر کی قوتوں کے تصادم کے منطقی نتیجے کے طور پر شر کی قوتیں مستولی نظر آتی ہیں حتیٰ کہ اچھے اچھے شریف النفس انسان بھی اخلاقیات سے عاری ہوتے جا رہے ہیں اور شیطان کے آلہء کار بنتے جا رہے ہیں۔ مکارمِ اخلاق کی تعلیم و تربیت ایک قصہء پارینہ بن چکی ہے۔ اسی پس منظر میں ان کی ایک غزل کے پانچ اشعار ہدیہء قارئین ہیں۔ غزل ہذا بحر ہزج مثمن محذوف میں کہی گئی ہے جس کا وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہے۔

نفرتوں کا زہر چاروں سمت ہے پھیلا ہوا
زندگی کو وحشتوں کا ناگ پھر ڈسنے لگا
ہاتھ میں پتھر اُٹھائے پھر رہا ہے آجکل
شیشہء دل کے مسیحا کو اچانک کیا ہوا
ڈار سے بچھڑے پرندے لوٹ کر آئے نہیں
تیر برسائے فضا نے رہزن رستہ ہوا
نیم شب میں کہہ رہا تھا خون دل کی داستاں
رات کی آنکھوں میں کاجل شام کا پھیلا ہوا
میں نے برجستہ کہا جو کچھ بھی میرے دل میں تھا
میری نادانی کا سارے شہر میں چرچا ہوا
وقت کی اس دوڑ میں شکوہ گلہ کس سے کروں
سوچتی ہوں جو ہوا جیسا ہوا اچھا ہوا

(ص:۲۷۹-۲۸۰)

یہ ایک مصدقہ حقیقت ہے کہ انسانی رویوں کا اثر مظاہرِ فطرت پر بھی ہوتا ہے کیونکہ انسانی

رویے اور مظاہرِ فطرت ایک دوسرے پر اثرات مرتب کرتے ہیں۔ جب سماج میں انسانیت امن سے محروم ہوئی تو لامحالہ طور پر اس کا اثر دیگر مخلوقات پر بھی ہوگا۔ اسی رویے کی غمازی ذرا شہناز مزمل کے ہاں بھی ملاحظہ کریں۔ شعر ہذا بحر ہزج مسدس محذوف میں کہا گیا ہے جس کا عروضی وزن مفاعیلن مفاعیلن فعولن ہے۔

پرندے بستیوں سے خوف کھا کر
اٹھا لائے ہیں تنکے آشیاں سے

(ص:۲۹۰)

اسی فکری تسلسل کی روایت ان کی آمدہ غزل کے مطلع میں بھی ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ مطلع ہذا ماقبل بحر ووزن میں کہا گیا ہے۔

ہوا بادل سے رک کر پوچھتی ہے
خزاں کی عمر کیوں بڑھنے لگی ہے ؟

(ص:۲۹۲)

عصرِ حاضر کا انسان اس قدر کج روی کا شکار ہوگیا ہے کہ دوست اور دشمن میں حدِ تفاوت معدوم ہوچکی ہے۔

دشمنی کے موسم میں احتیاط لازم ہے
دوستوں سے بچنا ہے سازشوں کے موسم میں

(ص:۳۰۰)

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ حالات عموماً نامساعد رہتے ہیں۔ اس لیے فطری طور پر ہر انسان شاکی رہتا ہے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ مستقبل کے حوالے سے اس کی حوصلہ افزا امیدیں قائم ہوتی ہیں۔ مگر اکثر واقات امیدیں بر نہیں آتیں۔

وقت ظالم کو زمانے نے مسیحا سمجھا
اور ہر اک درد کا اس کو مداوا سمجھا

(ص:۳۰۸)

حالات کی سنگینی اور واژ گونی کو ذرا ان کی غزل کے ایک مطلع میں ملاحظہ کریں:

صلیبِ وقت نے ایسا چنا سزا کے لیے
میں ہاتھ تک بھی اٹھا پائی نہ دعا کے لیے

(ص:۳۱۰)

انسانی بے مروتی اور بے حسی ایک شدید نوعیت کا عصری کرب ہوا کرتا ہے۔ جب یہ کیفیت ہو تو زندگی حبسِ مسلسل کی ایک تصویر بن جاتی ہے۔

کوئی آتا ہی نہیں ہے مرے غم خانے تک
دل کو بہلانے کو اک شامِ غریباں کرتے

(ص:۳۱۱)

جب زندگی میں تلخیاں فزوں تر ہو جائیں تو پھر معاملہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کے بمصداق ہو جاتا ہے۔ جب فصلِ گل خزاں سامانی کا منظر پیش کرے تو پھر تمام تر امیدیں چکنا چور ہو جایا کرتی ہیں۔ کچھ اسی نوع کی کیفیت شعر ہذا میں بیان کی گئی ہے۔

خزاں سے نوحہ کناں فصلِ گل پریشاں ہے
بدلتی رت میں یہ بتا اب کہاں جائیں ؟

(ص:۳۱۳)

ان کی غزل کا ایک مقطع عصری بے حسی کا بھرپور منظر نامہ پیش کر رہا ہے۔ مقطع ہذا بحر ہزج مسدس محذوف میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن فعولن ہیں۔

لیے سب ہاتھ میں پتھر کھڑے ہیں
نکل شہناز اب شیشے کے گھر سے

(ص:۳۱۵)

اب ہم ان کے آٹھویں شعری مجموعے "بعد تیرے" میں سے کچھ شعری استشہادات برائے

استخراجات لاتے ہیں۔

خودغرضی اور مفاد پرستی نے اعلیٰ اخلاقی اقدار کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ یہاں کسی کو کسی کا احساس تک نہیں ہے۔ عملی معاونت تو بعید از قیاس معاملہ ہے۔ انسان اپنی ذات کے حصار میں مقید ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ اپنی ذات کے خول سے کسی بھی صورت نکلنے کو تیار تک نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک یہی روش ہی دانش مندی اور اعلیٰ ظرفی کی مبینہ علامت ہے۔ ایسی صورت میں مثالی معاشرے کے قیام کا خواب کیسے شرمندۂ تعبیر ہو۔ ہر سو ایک نفسانفسی کا عالم بپا ہے۔ ایسی صورتِ حال کی عکاسی انہوں نے اپنی غزل کے ایک شعر میں کچھ یوں کی ہے۔ شعر ہذا بحر ہزج مسدس محذوف میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن فعولن ہیں۔

کہانی ہو بھلا کیسے مکمل ؟
یہاں تو سب کو ہی اپنی پڑی ہے

(ص:۳۳۹)

شہناز مزمل کے سخن میں خرد آموزی کے وسیع تر امکانات پائے جاتے ہیں یعنی ان کی فکریات میں جدت و ندرت کے شواہد بھی کارفرما ہیں۔ اس لیے وہ اپنے قارئین کی راہنمائی کا کٹھن فریضہ بھی انجام دیتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ یوں ان کا کلام بسیط افادی پہلوؤں کا حامل معلوم ہوتا ہے۔

تو زندگی کا طور طریقہ بدل ذرا
منزل نہیں ملی تو رستہ بدل ذرا

یوں محسوس ہوتا ہے کہ اب زندگی اپنی حقیقی قدر و قیمت کھو چکی ہے۔ اگر حقیقت پسندی سے دیکھا جائے تو انسان کے پاس خوش رہنے کا کوئی منطقی جواز نہیں رہا۔ طرب و رجا محض خواب بن کر رہ گئے ہیں۔ جن میں کوئی معنویت باقی نہیں رہی۔ زیست کی گاڑی اب طفل تسلی کی مرہونِ منت ہو کر چل رہی ہے۔

فریبِ آرزو کھاتے رہے ہیں

یونہی اس دل کو بہلاتے رہے ہیں

(ص:۳۴۹)

عصرِ حاضر کا انسان گوناگوں مسائل میں گھر کر رہ گیا ہے۔ پرامن زندگی کا خواب چہ مگوئیوں کی نذر ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کامیابی ہم سے کوسوں دور کھڑی مسکرا رہی ہے۔ خواب نامکمل ہیں۔ آرزوئیں ناتمام ہیں۔ ایسے میں یہ سخن بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے:

ہزاروں خواہشیں ہیں نامکمل
نئی امید کو مت راستہ دو

(ص:۳۵۴)

تمنائیں دم توڑ چکی ہیں۔ امیدوں کے چراغ گل ہو چکے ہیں۔ ہر سو ظلمت کے مہیب سائے منڈلا رہے ہیں۔ ہر سو نا امیدی چھائی ہوئی ہے۔ عصری بے حسی کے باعث انسانی زندگی کی تصویر بھیانک ہو چکی ہے۔

میں کسی پہر بھی دروازے کو کھولوں تو کیسے ؟
کون آئے گا سویروں کا اجالا دینے ؟

(ص:۳۵۶)

شہناز مزمل کے ہاں دہر کی آشوب زدگیوں کے خلاف ایک مزاحمت کا پہلو بھی کارگر ہے جو ان کے قوی تر عزم و حوصلے کی مبینہ دلیل ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں زندگی کرنے کی قوی تر شکتی موجود ہے۔

حد ظلم کی بڑھ جائے تو کچھ اور زیادہ
ظالم کے لیے دام بچھانا ہے ضروری

(ص:۳۵۸)

انسان جسے کارِ مسیحائی تفویض کیا گیا تھا، اس نے مشیت کے اصولوں سے انحراف کرنا شروع کر دیا ہے۔ جسے اس کی اخلاقی پستی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ دوسروں کے دکھ درد کم

کرنے کی بجائے ان میں مزید اضافے کا باعث بن رہا ہے۔ یوں ایک ہیجانی کیفیت فزوں تر ہو رہی ہے۔

ہمیشہ آبلے پھٹتے رہے ہیں
مسیحا کب کوئی پیدا ہوا ہے ؟

(ص:۳۵۹)

عبد اور معبود کے درمیان خلیج بہت وسیع ہو چکی ہے۔ انسان جس کو برائے بندگی تخلیق کیا گیا تھا، اور جسے عاجزی وانکساری کا شعار بخشا گیا تھا، وہ معبودیت کا دعویدار بن گیا ہے۔ بقول شاعر:

جب زمیں پر دیکھتا ہوں ان خداؤں کا وجود
سوچتا ہوں آسماں پر اب خدا کوئی نہیں

مشیتِ ایزدی نے عظمت و رفعت کو عجز و انکسار میں رکھا ہے مگر لوگ اسے غرور و تکبر میں تلاش کرتے ہیں۔ جس کے باعث وہ مخلوقِ خداوندی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ظلم بتدریج بڑھ رہا ہے اور مظلوم کی دادرسی نہیں ہو رہی جبکہ ظالم کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔ اس حوالے سے ان کی غزل کا ایک شعر لائقِ التفات ہے جو بحر متدارک مثمن سالم میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن ہیں۔

ہر طرف ہے خداؤں کا میلہ لگا
ایک مظلوم پر ظلم بڑھتا گیا

(ص:۳۷۸)

اسی فکری تسلسل کا اعادہ ایک غزل کے ایک اور شعر میں کچھ یوں کیا گیا ہے۔ شعر ہذا بحر ہزج مسدس محذوف میں کہا گیا ہے جس کا عروضی وزن مفاعیلن مفاعیلن فعولن ہے۔

کسی کو بھی نہیں خاطر میں لاتا
بس اپنے کو خدا سمجھا ہوا ہے

(ص:۳۸۰)

عصری بے حسی کے سبب اجتماعی عمرانی حوالے سے ایک احساسِ زیاں پایا جاتا ہے جس کی شدت میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اسی فکر کا مظہر ان کی ایک غزل کا یہ شعر بھی ہے جو بحر رمل مسدس محذوف میں کہا گیا ہے جا کے عروضی ارکان فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہیں۔

رائیگانی کے سفر میں آخرش
میں بھی یونہی رائیگاں ہو جاؤں گی

(ص:۳۸۵)

شہناز مزمل کے شعری بیانیے میں دعوتِ فکر و عمل دی گئی ہے۔ ہوش کے ناخن لینے کی ایک آموزش کارفرما ہے۔ عصری مقتضیات کی پاسداری کے عمل کی آموزش کی گئی ہے۔ ہر وقت ذہنی بیداری کا آدرش دیا گیا ہے۔ اپنے شریر میں شکتی پیدا کرنے کا آدرش دیا گیا ہے۔ ان کے فکری معروضات میں ایک منطقیت و معقولیت کارگر دکھائی دیتی ہے۔ بحر رمل مثمن محذوف میں کہا گیا ان کی غزل کا ایک شعر لائقِ توجہ ہے جس کا عروضی وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہے۔

سانپ اپنے ہاتھ سے بچ کر نکل بھاگا اگر
ہم فقط یاں پر لکیریں پیٹتے رہ جائیں گے

(ص:۳۸۷)

انسانی اعمال و افعال پر خود فطرت بھی محوِ حیرت ہے۔ جو حضرتِ انسان کے لیے ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ انسان کی بوالعجبی پر کبھی کبھی قدرت بھی خندہ زن دکھائی دیتی ہے۔ بقول شاعر:

تخلیقِ کائنات کے دلچسپ جرم پر
ہنستا تو آپ ہو گا یزداں کبھی کبھی

اگر انسان کو اس کے اقوال و اعمال کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ بات بصد تاسف کہنا پڑتی ہے کہ اس کی تخلیق عدم مقصدیت کا شکار ہو گئی ہے اور اس کے گرد لایعنیت کا حصار وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔

آئے گا نیچے اُتر کر جو کبھی میرا خدا

اس کو خود اپنی ہی تخلیق پہ حیرت ہو گی

(ص:۳۸۸)

عصری بے حسی کے سبب ہماری معاشریات میں ایک احساسِ رائیگانی ہے کہ بڑھتا جا رہا ہے۔ انسان میں موجود اعلیٰ اخلاقی اقدار و روایات معدوم ہو چکی ہیں۔ انسان صرف ایک گوشت پوست کا پیکر بن کر رہ گیا ہے جس کی حیثیت ایک خالی خول کی سی ہے جس میں سے عمدہ اور مثبت صفات کی بازیافت کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اسی حوالے سے ان کی غزل کا ایک مطلع قابلِ ذکر ہے جو بحر ہزج مسدس محذوف میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن فعولن ہیں۔

شرر کب راکھ میں باقی بچا ہے؟
کوئی مجھ میں بھلا کیا ڈھونڈتا ہے؟

(ص:۳۸۹)

وہ سچے زمانوں کی بات ہے جب انسان اجتماعیت آمیز زندگی بسر کرتا تھا اور ایک دوسرے کے شادی و غم میں شریکِ سفر رہتا تھا۔ لوگ دوسروں کے لیے جیتے تھے۔ پھر انسان مادیت پسندی اور خود غرضی کی ایسی بھینٹ چڑھا کہ جہاں اخلاقی معاملات قصۂ پارینہ بن کر صرف تاریخ کا حصہ ٹھہرے۔ اب یہی روش عام ہے کہ ہر کوئی اپنی زندگی جیتا ہے اور اپنی موت مرتا ہے۔ ایک دوسرے کا احساس مفقود ہے۔ اسی موقف کی تائید انہوں نے کچھ یوں کی ہے۔

اپنی خاطر آپ ہی مرنا پڑتا ہے
اپنی لاش اُٹھا کر چلنا پڑتا ہے

(ص:۳۹۴)

جب ہر سو سرد مہری کے رویوں کو فروغ حاصل ہو تو پھر انسان بے حس ہو جایا کرتا ہے۔ پھر اس پر سوز و فغاں بے اثر ہو جاتی ہے اور نہ ہی اس کے اسباب کوئی جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کے ہاں استفہامیہ اشارات کا عمدہ استخدام دیکھنے کو ملتا ہے۔

سرد مہری کے وقت میں اب کون؟
وجہء سوز و فغاں کو سمجھے گا

(ص:۳۹۶)

ساعتِ موجود کا گھمبیر اور گھناؤنا مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں قحط الرجال کا سامنا ہے۔ راہبروں اور قیادت کرنے والوں سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔ ہر شخص سنگ دل اور کٹھور دل واقع ہوا ہے۔ اسی صورت حال کی عکاسی ان کی غزل کے ذیل کے مطلع میں موجود ہے۔ مطلع ہذا بحر رمل مثمن محذوف میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہیں۔

کیا ہوا یہ کون اب انساں کا راہبر ہو گیا؟
آج میرے شہر کا ہر شخص پتھر ہو گیا

(ص:۳۹۷)

اسی فکر کا اعادہ مذکورہ غزل کے ایک اور شعر میں کچھ یوں کیا گیا ہے۔

اب یہاں تازہ ہوا کا بھی گزر ہوتا نہیں
المیہ یہ ہے کہ ہر اک ذہن بنجر ہو گیا

(ص:۳۹۸)

شہناز مزمل نے خود غرضی اور مفاد پرستی کی تصویر سماجی حوالے سے کچھ یوں کھینچی ہے جس کے بعد کچھ کہنے سننے، دیکھنے اور سوچنے کی گنجائش نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہے۔ شعر ہذا بحر ہزج مسدس محذوف میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن فعولن ہیں۔

پڑی دستار کی جب بھی ضرورت
سبھی نے سر کو اونچا کر لیا ہے

(ص:۴۰۱)

ہمارا عمرانی المیہ یہ ہے کہ یہاں مجبور و ناتواں کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ ایسی صورتِ حال مشاہدہ کرنے کے بعد ایک حساس دل انسان ماسوائے کڑھنے کے اور کر ہی کیا سکتا ہے۔ وہ

انسان دوستی کے جذبوں کی حامل ہیں، ان کی فکر میں ترقی پسندی کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ بحر رمل مثمن محذوف میں کہا گیا ان کی غزل کا مطلع قابلِ غور ہے جس کا عروضی وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہے۔

کس لیے ان منجمد سوچوں کو پگھلایا گیا
جانے کیوں مجبور بندے پر ستم ڈھایا گیا

(ص:۴۰۳)

وہ مکمل کلاسیکی ذہنیت رکھتی ہیں جس پر وہ فاخر و نازاں بھی ہیں۔ وہ اقدار و روایات پر جان چھڑکنے کو تیار رہتی ہیں اور ان پر عمل پیرا بھی ہیں۔ یہی ان کی زندگی اور موت کا مسئلہ بھی ہے۔ ماقبل غزل کا ایک اور شعر دیکھیے۔

ہر گھڑی اقدار کی سولی پہ ہم لٹکے رہے
پیچھے مڑ کے دیکھنا مت ہم کو بتلایا گیا

(ص:۴۰۴)

ایک ہیجانی کیفیت نے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ ایک عدم تحفظ کا احساس پروان چڑھا رہا ہے اور انسان کے اندر خود اعتمادی معدوم ہو چکی ہے۔ اس لیے انسان کے تجربات و مشاہدات محدود ہوتے جا رہے ہیں۔

یہ راستے یہ منزلیں بھٹکا نہ دیں کہیں
اس خوف نے تو گھر سے نکلنے نہیں دیا

(ص:۴۰۶)

سماج میں ہمدردی اور غمگساری کے جذبات مفقود ہو چکے ہیں۔ انسان ایک دوسرے کے دکھ درد سے آشنا نہیں ہے۔ خلوص و مروت کی کہانی صرف کتابوں میں ہی رہ گئی ہے جس کا عملی زندگی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اس لیے ساعتِ موجود کا انسان ایک شدید نوعیت کے احساسِ تنہائی میں گرفتار ہے۔ اس لیے وہ دشت نوردی پر مجبور ہے مگر وہاں بھی اسے گوشۂ عافیت حاصل

نہیں ہے۔

ہمارے درد کو کوئی نہیں سمجھتا
تو جا کے دشت کو صحرا کو غم سناتے ہیں

(ص:۴۰۹)

شہناز مزمل کے ہاں عصری بے حسی نے ایک عصری آشوب کی صورت اختیار کر لی ہے جس سے ان کی عمیق حسیات کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ اخلاص و مروت کے فقدان کے باعث یہ دنیا رہنے کے قابل ہی نہیں رہی۔ بحر ہزج مسدس محذوف میں کہا گیا ان کی غزل کا ایک شعر قابلِ ذکر ہے جس کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن فعولن ہیں۔

ابھی تک کربلا بھولے نہیں ہیں
زمانہ یہ مکمل کربلا ہے

(ص:۴۱۰)

ہمارے ذہن اور ہماری سوچ پر خوف مسلط ہے جس سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں اخلاقیات کی عمل داری مکمل طور پر مفقود ہے۔ نہ جانے کتنی نسلوں کو اس ہیجانی کیفیت کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ ہمت و حوصلہ اور اعتماد کی فضا کب بحال ہوگی؟

ضرر رساں تو نہیں ہم تو بے ضرر سے ہیں
نہ جانے کیوں ہمیں ہر شخص ڈر کے دیکھتا ہے

(ص:۴۱۱)

شہناز مزمل کے کلام سے یہ مبینہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ انہوں نے روحِ عصر رقم کرنے کی عمدہ کوشش کی ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے عہد سے نہ صرف اثرات قبول کیے ہیں بلکہ اپنے دور پر اثرات مرتسم بھی کیے ہیں۔

باب نہم

ڈاکٹر شہناز مزمل کی شعری رومانیت

جہانِ سخن مختلف موضوعات سے آراستہ ہے۔ نو بہ نو مضامین کائناتِ شعر کا حصہ بن رہے ہیں۔ کلاسیکی شعری عہد کی طرح شاعری کا دائرۂ کار اب محدود نہیں رہا۔ شعری موضوعات میں سے کچھ موضوعات ایسے بھی ہیں جنہیں کلاسیکی اعتبار حاصل ہے جو ہر شعری عہد میں تروتازہ رہے ہیں۔ ان موضوعات میں رومان کو اختصاصی اعتبار حاصل ہے۔ رومان کا فکری کینوس بسیط وعریض ہے جس میں عشق والفت، مہر ومحبت، طرب ورجاالغرض ہر نوع کے خوشگوار احساسات شامل ہیں۔ رومانوی تحریک تاریخِ شعر کا ایک تابناک دور ثابت ہوئی۔ ہر عہد کے کے جدت پسندوں نے اس موضوع کی بڑی شدت سے مخالفت کی مگر کوئی بھی اس کا بال بیکا نہ کر سکا اور وہ اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہے کہ یہ ہر عہد میں لازوال رہنے والا موضوع ہے۔

شذرہ ہذا میں ہم شہناز مزمل کے کلام کے رومانوی پہلو کے حوالے سے رقم طراز ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی کلیاتِ غزل "منتہائے عشق" مطبوعہ جنوری ۲۰۱۹ء ہمارے روبرو ہے۔ اسی نسبت سے ہم ان کے نویں مجموعہء کلام "عشق سمندر" سے شعری استشہادات برائے استخراجات لائیں گے۔ بعد ازاں دیگر مجموعہ ہائے کلام بھی زیرِ بحث آئیں گے۔

محبت ایک لازوال جذبہ ہے جو بہت سی قربانیوں سے مربوط ہے اور انسان سے لامتناہی ایثار کا تقاضا کرتا ہے جس میں جفاؤں کے بدلے وفا کی جاتی ہے اور محبوبِ جاں نواز پر سب کچھ نچھاور کر دیا جاتا ہے۔ اس کے ہر ظلم وستم کو برداشت کیا جاتا ہے اور اس سے عمر بھر وفائیں کی جاتی

ہیں۔اسی تناظر میں ان کی غزل کا ایک شعر قابلِ غور ہے جو اسلوبیاتی اعتبار سے سہلِ ممتنع کے رنگ کا حامل ہے۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے سہل نگاری کی روایت کو تقویت بخشنے کی سعیِ جمیل کی ہے۔شعر ہذا بحر ہزج مسدس محذوف میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن فعولن ہیں۔

تمہاری سب جفاؤں کو بھلا کر
تمہی سے میں وفا کرتی رہی ہوں

(ص:۴۲۵)

ان کی رومانویت خود میں ایک طرب و رجا کی کیفیت رکھتی ہے۔جو ہر طرح کے خوشگوار احساسات سے آراستہ ہے۔یہ ایک حقیقیت ہے کہ رومانی جذبے انسان کو فرحت وتازگی بخشتے ہیں اور انسان ایک طرح کا کیف وسرور محسوس کرتا ہے۔اسی حوالے سے ان کی غزل کا ایک شعر دیکھیے جو بحر رمل مثمن محذوف میں کہا گیا ہے جس کا عروضی وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہے۔

ان بہاروں میں پکارا ہے کسی نے پیار سے
ہو گیا احساسِ منزل آج اک مدت کے بعد

(ص:۴۳۲)

شہناز مزمل کے فحوائے شعر میں تلمیحات کا استخدام عمدگی کے پیرائے میں ملتا ہے۔انہوں نے کچھ اس انداز سے رومان نگاری کی ہے کہ محبوب کا ستم بھی کرم محسوس ہوتا ہے۔ان کے جہانِ تخیل میں محبوب ایک مافوق الفطرت اور نادرالنظیر کردار ہے جس میں مثالیت کا اختصاص پایا جاتا ہے۔ان کا حصارِ ضبط انتہائی قوی نوعیت کا حامل ہے۔محبوب کی تلخ گوئی بھی انہیں شیریں نوائی محسوس ہوتی ہے۔گویا ان کے ہاں محبت میں ایک اذیت پسندی کا پہلو پایا جاتا ہے۔ان کی غزل کے تین اشعار رومانوی پسِ منظر میں قابلِ ذکر ہیں۔یہ اشعار بحر رمل مثمن محذوف مخبون میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فعلن ہیں۔یہ اختراعی نوعیت کا وزن ہے۔

وہ ہے سقراط نہ سقراط کے ثانی جیسا

زہر بھی دیتا ہے تو لگتا ہے پانی جیسا
اُس کی کوئی بھی ادا دل پہ گراں کب گزری
زخم بھی لگتا ہے اب اُس کی نشانی جیسا
لفظ کچھ تلخ سہی اَس کے لیے کیا کہیئے
لہجہ رکھتا ہے وہ دریا کی روانی جیسا

(ص: ۴۳۴)

شہناز مزمل کی فکریات میں محبت کا ایک تقدیس آمیز تاثر ملتا ہے جس میں ایک روحانیت کا پہلو کارفرما ہے جو خود میں تذکیہء نفس، تطہیرِ ذات اور کتھارسز کے امکانات رکھتا ہے۔ ان کا حصارِ ضبط اور پندارِ انا انتہائی تندرست وتوانا اور قوی تر ہے جس سے ان کے عزم وحوصلے کی نوید ملتی ہے۔ ان کی محبت میں بے خودی کا عنصر نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ محبوب ان کے لیے باعثِ کیف و سرور اور موجبِ بہار سامانی ہے اور اس کے تکلم کی شیرینی دلوں کو موہ لیتی ہے۔ اسی نسبت سے ان کی ایک غزل کے چھ اشعار نذرِ قارئین ہیں جو بحر ہزج مسدس محذوف میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن فعولن ہیں۔

دل و جاں سے میں اُن کی منتظر ہوں
محبت ہاتھ پھیلائے کھڑی ہے
تجھے دیکھا بنا پوجا ہے میں نے
یہ کتنی خوبصورت آگہی ہے
مجھے تنہائیوں نے ڈس لیا ہے
یوں چپ رہنے کی عادت ہو گئی ہے
بنا رکھا ہے اُن کو جاں کا محور
فنا ہستی نشّے میں گھومتی ہے
چلے آؤ کہ یہ منظر ہی بدلے

خزاں تو جان لیوا ہو گئی ہے
بہت ہی خوب ہے اُن کا تکلم
عجب چاہت عجب شائستگی ہے

(ص:۴۳۹-۴۴۰)

ان کی شاعری میں حوصلہ افزا امر یہ ہے کہ ان کے ہاں صرف حزن و ملال یا یاس وقنوطیت ہی نہیں ہے بلکہ ایک احساسِ طرب ہے اور ایک خوشگواریٔ فکر ہے جو بین الشعر کارفرما ہے۔ایک رجاعی احساس ہے جو ہر نوع کی مسرت وتمکنت سے عبارت ہے۔ایک عزم وحوصلے اور یقین و اعتماد کی فضا ہے جس سے ایک صحت مند کلام کا تاثر اجاگر ہوتا ہے۔

مجھے یقین ہے آئے گا ایک دن ایسا
جو کھو گئی ہے محبت وہ ہم سفر ہو گی

(ص:۴۴۶)

بسا اوقات شہناز مزمل کی رومانویت آفاقیت ومثالیت کی ردا اوڑھ لیتی ہے۔جس میں بے پناہ وسعت و ہمہ گیری ہوتی ہے جو انفرادی احساس کی بجائے اجتماعی فکر کی عکاسی سے مربوط ہوتی ہے۔وہ معاشرے میں مہر ومحبت اور خلوص ومروت کی اہمیت سے آشنا ہیں۔ان کی کمی کو بڑی شدت سے محسوس کرتی ہیں۔

بے ثمر ہونے لگیں بستیاں پھر سے
پیار کا پودا ذرا پھر سے لگایا جائے
کوئی خوشبو نہیں، تتلی بھی نہیں، گل بھی نہیں
سبز موسم کو ذرا ڈھونڈ کے لایا جائے

(ص:۴۵۳)

وہ محبت میں کچھ اصول وضوابط اور وضع داری کی قائل ہیں۔شرم وحیا کی پاسداری کو انہوں نے محبت کی شرطِ اول گردانا ہوا ہے۔محبت میں ان کا ضبط اور پندار انا مضبوط و مستحکم ہے۔وہ ہر چیز

کو اس کے مخصوص دائرۂ کار میں رکھتی ہے۔ان کی بے خودی ان کو خرد سے مکمل طور پر بیگانہ نہیں کرتی۔ وہ ہر حال میں شخصیت کا بھرم رکھنے کی قائل ہیں۔ان کا تخاطب چاہے محبوب ہو یا اربابِ اقتدار سے یا اہلِ ثروت سے وہ اپنی انا پر کسی نوع کا سمجھوتہ روا نہیں رکھتیں۔اسی تناظر میں ان کی غزل کا ایک شعر ہدیہء قارئین ہے جو بحر ہزج مسدس محذوف میں ہے جس کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن فعولن ہیں۔

تمہارے در پہ کیوں سر کو جھکائیں؟
کیوں اپنے کو خدا سمجھا ہوا ہے؟

(ص:۴۵۶)

ان کی ایک اور رومانویت سے معمور غزل بدونِ تجزیہ ملاحظہ کریں جس کا تبصرہ ہم قارئین کی صوابدید پر چھوڑتے ہیں۔دیدہ باید کہ وہ اس حوالے سے کیا رائے قائم کرتے ہیں۔

کبھی منزلیں بدلنا کبھی راستوں میں آنا
کبھی دوستی نبھانا کبھی دشمنوں میں آنا
ذرا تھوڑا غور کرنا ہمیں چھوڑنے سے پہلے
کبھی نفرتیں پرکھنا، کبھی چاہتوں میں آنا
مری خواہشوں کی مسند پڑی مدتوں سے خالی
کبھی خواب ہی دکھانا کبھی رتجگوں میں آنا
یہ سفر محبتوں کے کبھی طے ہوئے اکیلے
کبھی ساتھ ساتھ چلنا کبھی منزلوں میں آنا
مرا ہم سفر اچانک کیوں بچھڑ گیا ہے مجھ سے
تمہیں دیکھنا میں چاہوں کبھی آئینوں میں آنا
ہے دردیدہ جسم سارا پڑے پاؤں میں ہیں چھالے
کبھی مرہموں کی صورت مرے آنگنوں میں آنا

(ص:۴۶۰)

شہناز مزمل عشق و محبت کی تمام تر کٹھنائیوں اور سنگینیوں کا بخوبی ادراک رکھتی ہیں۔ یہی امر ان کی بالیدہ فکری کی مبینہ دلیل ہے۔ یوں ان کا تخیلاتی کینوس بسیط و عریض ہو جاتا ہے جس میں معقولیت و معروضیت اور منطقیت کارگر ہے۔ فکری و لسانی اعتبار سے ان کے ہاں لایعنیت و عدم مقصدیت معدوم ہے۔ یوں ان کے ہاں مقصدیت کی عمل داری پائی جاتی ہے اور مدعا نگاری کا حسین قرینہ آشکار ہوتا ہے۔ شفاف و شستہ اسلوب اور فکری و لسانی دقیقہ سنجی سے گریز ان کی ادبی متانت و سنجیدگی کا مظہر ہے۔ اسی حوالے سے ان کی غزل کا ایک شعر جو بحر خفیف مسدس سالم مخبون محذوف میں کہا گیا ہے، قابلِ ذکر ہے جس کا عروضی وزن فاعلاتن مفاعلن فعلن ہے۔

عشق منزل کے ہم مسافر ہیں
سب مصائب کو جانتے ہیں ہم

(ص:۴۷۱)

ان کے شعری اظہار میں دبستانِ دہلی کا ایک تہذیبی رچاؤ اور ایک وضع داری کارفرما ہے جو انہیں جہانِ شعر میں معتبر کرنے کی ایک وقیع دلیل ہے۔ اس لیے وہ ذاتی حوالوں کے لیے بھی جمع متکلم کے صیغے کو بروئے کار لائی ہیں جسے احترامِ ذات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ اندازِ سخن بہت کم شاعرات کے ہاں نمودار ہوا ہے۔

رومانوی حوالوں سے ان کے ہاں استفہامیہ اشارات کا استخدام ان کی فکری و فنی اور لسانی کرشمہ کاری کا مظہر ہے۔ ان کی رومان پروری مظاہرِ فطرت سے ہم آغوش ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے جس کی بدولت ان کے سخن میں جمالیاتی اقدار و روایات کی بازیافت کا عمل سہل تر ہو جاتا ہے۔ یوں ان کا کلام آمد اور فطری رچاؤ کی ردا اوڑھے ہوئے محسوس ہوتا ہے۔ ان کا استفہامیہ طرزِ اظہار حسیاتی و نفسیاتی اور فلسفیانہ حوالوں سے نئے اعماق و آفاق کے ابواب وا کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کا رومانوی کلام خود میں جذب و کیف، سرور و سرمستی اور سرخوشی و سرشاری کے خصائص رکھتا ہے۔ ان کے نزدیک محبوب کا درشن کسی نعمتِ غیر مترقبہ کا بمصداق ہے۔

خوشبو ہو کہ سایہ ہو، کوئی خواب ہو کیا ہو
ساحل ہو بھنور ہو کوئی گرداب ہو کیا ہو
اِک گونہ سکوں دل کو ملا دیکھ کے تم کو
اُمید کا بڑھتا ہوا سیلاب ہو کیا ہو
چڑھ جائے جو سر پر تو اُترتا ہی نہیں ہے
تم عشق ہو نشّہ ہو مئے ناب ہو کیا ہو

(ص:۴۷۵)

شہناز مزمل کے جہانِ تخیل میں عشق ومحبت کے عمومی پہلوؤں کے پہلو بہ پہلو اختصاصی رویے بھی پائے جاتے ہیں جو جدت وندرت کے حامل بھی ہیں۔کلاسیکی شعروادب میں اہلِ عشق کو درماندہ وآشفتہ حال، درویش ومجذوب اورایک رند بدمست کے طور پر پیش کیا گیا ہے مگران کے ہاں ایسا ہرگز نہیں۔گویا ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ جدت کے تناظر میں ان کے ہاں روایت سے بغاوت کی روش عام بھی پائی جاتی ہے۔گویا ان کا عشق جدتوں کا حامل ہے۔ان کے شعری بیانیے میں کسی نوع کی کاہلی وسستی کا کوئی جواز نہیں ملتا۔یعنی ان کے عشق میں عزم وحوصلے، جوش وولولے اورایک طرح کی مستعدی کی سبیل پائی جاتی ہے۔اسی پس منظر میں ان کی غزل کا ایک شعر سپردِ قرطاس ہے جو بحر ہزج مثمن سالم میں کہا گیا ہے جس کا عروضی وزن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ہے۔

میں عاشق ہوں ہراک حد سے گزر جانے کی عادت ہے
تساہل کب ہے مجھ کو اک نئی تدبیر کرنے میں

(ص:۴۷۹)

ان کے جذبہءمحبت میں عمومیت کم اوراختصاصیت فزوں تر ہے۔عام طور پر ہجر کے حوالے سے بیزاری کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے مگران کے ہاں ایسا ہرگز نہیں ہے۔انہیں لمحاتِ ہجر میں بھی سوادِاعظم کی بہار سامانی محسوس ہوتی ہے۔اس لیے وہ شبِ فراق کے طول کو خود ہی بڑھاوا دیتی ہیں

تا کہ انہیں ایک طرح کا تلذذ محسوس ہو۔

لذت عجب ملی ہمیں لمحاتِ ہجر میں
طولِ شبِ فراق کو خود ہی بڑھا دیا

(ص: ۴۸۳)

شہناز مزمل کے ہاں شدید نوعیت کا احساس تنہائی اپنی تمام تر کرب ناکیوں کے ساتھ موجود ہے۔ جس میں ہر نوع کے کرب کی کیفیت کو مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ تنہائی ان کے لیے مرگ سامانی کا مظہر ہے۔ اس لیے وہ احساسِ خلوت سے راہِ گریز اختیار کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

اب سہا جاتا نہیں تیرا وجود
اے مری تنہائی مجھ کو چھوڑ دے

(ص: ۴۸۴)

معاملاتِ عشق و محبت میں ان کا شمار اہلِ احتیاط میں ہوتا ہے۔ اس لیے محب و محبوب کے درمیان مناسب فاصلے کی قائل ہیں۔ وہ محبت کے تحفظ کی خواہاں ہیں۔ اس حوالے سے وہ قرائنِ الفت کی آموزش چاہتی ہیں۔ ان کی یہی خصوصیت انہیں راہِ محبت میں بالیدہ فکری عطا کرتی ہے اور وہ جادۂ منزل پر گامزن رہتی ہیں۔ وہ مہر و الفت کے حوالے سے یکسانیت سے گریزاں رہتی ہیں۔ انہیں راہِ عشق میں متنوع کیفیات درکار ہیں۔ کبھی عالمِ وصل ہو تو کبھی جہانِ فرقت ہو اور کبھی وصل ہو تو کبھی دورِ خزاں ہو، یہی امر ان کی فکری وسعت کی شاندار دلیل ہے۔ اسی تناظر میں ان کی غزل کے تین اشعار زینتِ قرطاس ہیں۔ اشعار ہذا بحر ہزج مثمن سالم میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ہیں۔

میں اپنے اور اُس کے درمیاں اِک فاصلہ
چاہوں
محبت کو بچانے کا سلیقہ سیکھنا چاہوں
کبھی اِک پل کی دُوری بھی گوارا کر نہیں سکتی

کبھی ترکِ تعلق کیلئے اِک راستہ چاہوں
خزاں رُت کی یہ ویرانی تو اب اچھی نہیں لگتی
کسی بدلے ہوئے موسم کا منظر دیکھنا چاہوں

(ص:۴۸۹)

اب ہم شہناز مزمل کے دسویں مجموعہء کلام "عشق مسافت" کے حوالے سے اپنے تجزیاتی عمل کو آگے بڑھاتے ہیں۔

ان کے نزدیک عشق ایک کارِ دل نوازی تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک عبادت ہے اور تخلیقِ آدم کا مقصود و منتہا بھی یہی ہے مگر ان معاملات کی تفہیم کے لیے انسان کو یقینِ کامل کی دولت بھی میسر ہونی چاہیے۔ بحر خفیف مسدس سالم مخبون محذوف میں کہا گیا ان کی غزل کا یہ شعر دیکھیے جس کے عروضی ارکان فاعلاتن مفاعلن فعلن ہیں۔

گر یقیں ہے تمہارا کامل تو
عشق کرنا بھی اک عبادت ہے

(ص:۴۹۷)

عشق و محبت کے جذبات خود میں ذوقِ خود نمائی رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے جتنی بھی رازداری روا رکھی جائے، ناکافی ہے کیونکہ اگر محبت لاکھ پردوں کے حصار میں بھی ہو، تو پھر بھی وہ جلوہ گری پر آمادہ ہوتی ہے۔ وضاحت طلب امر یہ ہے کہ جادۂ الفت پر رازداری کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سماج میں محبت کے معاملات کو نگاہِ استحسان سے نہیں دیکھا جاتا اور اہلِ محبت ناکام و نامراد رہ جاتے ہیں۔

ڈھونڈ نہ لے کوئی تجھ کو میرے اندر
تیری خاطر ہی تو میں گمنام ہوئی

(ص:۵۳۱)

چاہت کا دیا آس کے جھونکوں سے جلتا رہتا ہے اور یہ امید بھی کچھ ایسی ہوتی ہے جو محتاجِ

امکانات نہیں ہوتی۔ یادوں کے چراغوں کا تواتر سے جلنا ایک عمیق رجائی تاثر کا حامل ہے۔

کوئی آہٹ نہیں دستک بھی نہیں تم بھی نہیں
پھر بھی امید کا دروازہ کھلا رہتا ہے

اس کی یادوں کے چراغوں کو بجھاؤں کیسے
آس کا دیپ ہواؤں میں جلا رہتا ہے
ایک مانوس سی خوشبو ہے فضا میں موجود
وہ یہیں پر ہی کہیں میں نے سنا رہتا ہے

(ص:۵۵۱)

اب ہم ان کے گیارہویں شعری مجموعے "عشقِ مسلسل" کے تناظر میں ان کے رومانوی کینوس کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔

شہناز مزمل کے سخن کا نکتہء اختصاص یہ ہے کہ وہ عمومی دائروں میں رہتے ہوئے بھی بڑے بڑے فلسفے تخلیق کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک محبت ایک طویل الریاضت عمل ہے۔ ان کی کائنات صرف محبوب کی ذات کی حد تک ہی محدود ہے جس کی چاہت کو وہ عبادت کا درجہ دیتی ہیں۔ یوں ان کے ہاں محبت کا ایک صاف، شفاف اور شستہ تصور اجاگر ہوتا ہے۔

محبت کر تو لی میں نے مگر یہ اک حقیقت ہے
تجھے ملنا تجھے پانا بہت لمبی ریاضت ہے
تصور میں رہے تو ہی تجھی سے بات ہو میری
یہی چاہت ہے میری اور یہ میری عبادت ہے

(ص:۵۸۷)

ان کا نظریہء محبت شاعرِ رومان اختر شیرانی کی طرح رازداری کے عمل سے مبرا و ماورا ہرگز نہیں ہے جبکہ ان کے ہاں ایک وضع داری اور تہذیبی رکھ رکھاؤ کا پہلو پایا جاتا ہے۔ وہ محبت کے شستہ تصور کو اجاگر کرنے کے لیے کربل کے حسیں استعارے کو بروئے کار لائی ہیں۔ وہ راہِ محبت

میں تشہیر کی قائل ہرگز نہیں ہیں۔ وہ عشق میں مادیت پسند رویوں کی شدید مذمت کرتی ہیں۔ وہ محبت میں ایک اخلاقی اعتبار کی قائل ہیں۔

ہم عشق کو اپنے کبھی رسوا نہیں کرتے
عاشق ہیں مگر عشق تماشا نہیں کرتے
کربل تو اصل میں ہے محبت کی انتہا
چپ چاپ جاں سے جاتے ہیں چرچا نہیں کرتے
عاشق کو نہیں چاہیے یہ دولتِ دنیا
بیکار اثاثوں کو سنبھالا نہیں کرتے

(ص:۵۹۸)

مذکورہ استشہادات واستخراجات سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ان کی شاعری میں رومان نگاری کے حوالے سے خاطر خواہ مواد موجود ہے جس میں عمومیت اور اختصاصیت دونوں انداز کارفرما ہیں۔ ان کی فکر میں اخلاص ومروت، عاجزی وانکساری، پندارِانا اور جوابی رویوں کے خصائص پائے جاتے ہیں۔ یہ خصائص انہیں نسائی شعری منظرنامے پر ممتاز ومنفرد کرتے ہیں۔

باب دہم

ڈاکٹر شہناز مزمل داخلی احساسات کی شاعرہ

تخلیقِ شعر ایک داخلی اور وجدانی عمل ہے۔ ایسے جذبات جو خالصتاً شاعر کے دروں سے نمو پاش ہوتے ہیں، داخلی احساسات کہلاتے ہیں۔ خارجی عوامل جب دروں کی دنیا پر اثر انداز ہوتے ہیں، تو وہ پھر اظہار کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ عرضِ مدعا یہ ہے کہ خارجیت بھی داخلیت پر گہرے نقوش ثبت کرتی ہے۔ یہ دونوں فکری خصائص لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں مگر پھر بھی ان دونوں کے مابین ایک تفریق ہے۔ داخلیت کا مطالعہ شخصیت کی افہام وتفہیم کے لیے ناگزیر ہے جبکہ خارجیت سماجیات کے ادراک کی مظہر ہے۔ دنیائے سخن میں دونوں کی اہمیت مسلمہ ہے۔ عموماً شاعرات کا شعری شعور داخلی افکار کا غماز ہوتا ہے جو ان کی دروں بینی کا عکاس ہوتا ہے۔ آج ہم ڈاکٹر شہناز مزمل کے کلام کا تجزیہ داخلی احساسات کے تناظر میں کریں گے جن کا تعلق دبستانِ لاہور سے ہے۔ جن کی تادمِ تحریر تین درجن سے زائد ادبی تصانیف زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر دنیائے شعروادب سے داد وتحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ان کی ہر تصنیف اپنے اندر فکر وفن کا ایک نیا جہان رکھتی ہے۔ شذرہ ہذا میں ہم ان کے شعری مجموعے "عشق سمندر" کے ربع اول کے منتخب غزلیہ اشعار کا تجزیہ پیش کریں گے۔

عشق بھی ایک داخلی جذبہ ہے جس کے مظاہر خارج میں بھی مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح خوف بھی ایک داخلی کیفیت ہے جو انسان کے ظاہر و باطن پر محیط ہوتا ہے۔ اس کے گہرے تاثر کے باعث مہیب صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پھر انسان اپنے سائے سے بھی خائف

نظر آتا ہے۔ راہِ عشق میں تمام عمر تلاشِ منزلِ جاناں میں گزرتی ہے اور قرب کا ایک لمحہ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ جب انسان خواہشوں کا غلام بن جائے تو حسرتوں کے باب وا ہو جاتے ہیں۔ پھر تمناؤں کی دنیا پر حزن و ملال مسلط ہو جاتا ہے۔ یہ سب معاملات ذات سے علاقہ رکھتے ہیں اور ذات ہی دروں کا مستقبل اور معتبر حوالہ ہے۔ اسی نسبت سے ان کے تین اشعار ملاحظہ ہوں

خوف انجانا رگ و پے میں سرایت کر گیا
اور پھر انسان اپنے سائے سے خود ڈر گیا

مدتوں سے میں بھٹکتی تھی تلاشِ یار میں
عشق کو میرے مکمل ایک لمحہ کر گیا

ہر کوئی شہناز اپنی خواہشوں کا ہے غلام
منظرِ شہرِ تمنا سب کو پُر نم کر گیا

جب زندگی کے مصائب و آلام دروں کی دنیا پر اثر انداز ہوتے ہیں تو پھر انسان سنسار کو تنقیدی نگاہ سے دیکھتا ہے اور شکوہ سنج نظر آتا ہے۔ تخلیقِ کائنات کی حقیقت مذموم نظر آتی ہے۔ لیکن زیست کی مسافت میں عشق ایک مینارِ نور ثابت ہوتا ہے۔ اگر اس کی راہنمائی شاملِ حال نہ ہو تو انسان گردِ راہ بن جاتا ہے۔ ہر جگہ محبوبِ حقیقی کی جلوہ سامانی نظر آتی ہے۔ جیسے میر دردؔ نے کہا تھا:

جگ میں آ کر ادھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

انہی افکار سے متصف ان کی غزل کے تین اشعار آپ کے ذوقِ طبع کی نذر ہیں۔

زندگی کربِ مسلسل اک مسلسل امتحاں
کیا اسی کے واسطے تو نے بنایا یہ جہاں

عشق نے کی راہنمائی یہ بہت اچھا ہوا
جانے کس رستے پہ لے جاتا غبارِ کارواں؟

کیا کوئی ایسی جگہ بھی ہے جہاں پر تو نہ ہو
کس لیے پردہ ہے حائل تیرے میرے درمیاں

ذات سے انحراف فطری حقائق سے روگردانی کے مصداق ہے۔جس نے اپنے آپ کو نہیں پہچانا، اس نے اپنے رب کو نہیں پہچانا۔اس لیے عرفانِ ذات ناگزیر ہے۔اس لیے انسان تمام عمر اپنی ذات کی تلاش میں رہتا ہے۔ذات کی بازیافت عرفان و آگہی کی منزل ہے۔ہم دنیاداری کے جھمیلوں میں اتنا کھو جاتے ہیں اور ہمیں خود سے محبت نہیں رہتی۔بقول راقم الحروف:

مجھے خود سے ملنے کی فرصت نہیں ہے
حقیقت میں خود سے محبت نہیں ہے

دور بدلتا ہے۔اس کے تقاضے بدلتے ہیں۔اگر تغیرِ حال کے اثرات ہم پر مرتب نہیں ہوئے تو ہم خود کو اجنبی محسوس کرتے ہیں اور یہ اجنبیت بیگانگی کی علامت ہے۔راہِ عشق میں انسان تمام مصائب و آلام سے آشنا ہو جاتا ہے۔حقیقت کا عرفان ہی سرچشمہء آگہی ہے۔ان افکار کی جھلک ان کی غزل کے تین اشعار میں دیکھتے ہیں۔

جبکہ خود سے بچھڑ گئے ہیں ہم
کس لئے خود کو ڈھونڈتے ہیں ہم؟
لوگ بدلے تو ایسا لگتا ہے
اپنے ہی شہر میں نئے ہیں ہم
عشق منزل کے ہم مسافر ہیں
سب مصائب کو جانتے ہیں ہم

ڈاکٹر شہناز مزمل معرفت کی شاعرہ ہیں۔ان کا عشق حقیقی نوعیت کا ہے۔اس لیے تمام موجودات میں انہیں خالقِ کائنات کی ذات دکھائی دیتی ہے۔تمام سنسار اسی کا ہی پرتو نظر آتا ہے۔قلب و زباں پر اسی کے ہی ترانے ہیں۔وہ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔اس کی دوری بعید از بصارت ہے۔

اسی حوالے سے ان کی غزل کا ایک شعر دنیائے شعر کے متوالوں کی نذر ہے۔

موسم بدلے رت بدلی ہے منظر بدلے
ہر شئے میں بس اس کی ذات دکھائی دے

وہ عشقیہ کیفیات و واردات کو رقم کرنے میں یدِ طولیٰ رکھتی ہیں۔ رومانی جذبات و احساسات ان کے کام میں بھرپور انداز میں جلوہ نما ہیں۔ کسی بھی صورتِ حال کی ترجمانی احسن و موثر طریقے سے کرنا ان کے شعری شعور کا حصہ ہے۔ ایک ہی مصرع کے پیمانے میں کئی فکری تلازمے پائے جاتے ہیں جو ان کے کمالِ فن کاری کی دلیل ہے۔ طویل المعیا دشعری ریاضت کی بدولت ان کا فن کہنہ مشقی کا مظہر ہے۔ اسی تناظر میں ان کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ کریں۔

چڑھ جائے جو سر پر تو اترتا ہی نہیں ہے
تم عشق ہو نشہ ہو مئے ناب ہو کیا ہو؟

عشق کی بدولت انسان سوز و گداز کا شناور بن جاتا ہے۔ سوزِ ہجراں کے باعث مسلسل اضطراب کا عمل جاری و ساری رہتا ہے۔ یہ حزن و ملال لازوال اور دائمی ہوتا ہے۔ یہ بے تابی پھر پورے ماحول کا حصہ دکھائی دیتی ہے۔ اسی نسبت سے ان کی غزل کا ایک شعر پیش ہے۔

آگ سینے میں جو بھڑکی تو بھڑکتی ہی گئی
دور تک درد کا جلتا ہوا صحرا دیکھا

ان کے داخلی احساسات گہرائی و گیرائی کے حامل ہیں جس سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ داخلیت پر بھرپور دستگاہ رکھتی ہیں۔ جب انسان کو چار سو خوف کے سائے مہیب نظر آئیں تو وہ اپنی ذات کے اندر پناہ لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اپنے اندر کی ہی دنیا میں بسا کرتے ہیں
کیا کریں گردشِ حالات سے ڈر لگتا ہے

مذکورہ شواہد شاہد ہیں کہ ڈاکٹر شہناز مزمل کے ہاں داخلی افکار وفور سے ملتے ہیں۔ ان کا شمار ان شاعرات میں ہوتا ہے جن کے حوالے سے ناقدینِ فن کے مابین ایک معتبر رائے ملتی ہے۔ اگر ان کا شعری سفر تسلسل سے جاری و ساری رہا تو ان کے فکر و فن میں مزید بالیدگی آشکار ہوگی۔

باب یازدہم

ڈاکٹر شہناز مزمل کی غزل کے فکری موضوعات

زندگی کے ہر شعبے میں ارتقا کا عمل بتدریج جاری وساری ہے اور یہ سلسلہ ازل تا ابد رہے گا۔ ہر چیز کلاسیکیت کے دائروں سے نکل کر جدیدیت کے حصار میں مقید ہوتی جا رہی ہے۔ ادب عموماً اور خصوصاً غزل میں یہی اصول برقرار ہے۔ غزل اپنی کلاسیکی تعریف کی حد تک محدود نہیں رہی۔ معاصر غزل وسعتوں کی حامل ہے جو دنیا جہان کے تمام موضوعات کو سمیٹے ہوئے ہے۔ شذرہ ہذا میں ہم شہناز مزمل کی غزل کے موضوعاتی حوالے سے رقم طراز ہیں۔ انہوں نے جزوی وکلی طور پر اکثر و بیشتر موضوعات کو مس کرنے کی سعیِ مندوب کی ہے۔ جہاں کلاسیکی اور روایتی موضوعات بھی ہیں، جدید فکری جہتیں بھی ان کے غزلیہ کینوس کا حصہ ہیں۔ اس وقت ان کی کلیاتِ غزل "منتہائے عشق" مطبوعہ جنوری ۲۰۱۹ء ہمارے سامنے ہے جس میں ان کے گیارہ مجموعہ ہائے شعر شامل ہیں۔

اولاً ہم ان کے پہلے مجموعہ ءکلام "پیامِ نو" سے شعری استشہادات برائے استخراجات لائیں گے۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے دیگر مجموعہ ہائے شعر بھی موضوع ماقبل کی نسبت سے زیرِ بحث لائیں گے۔

انسان دوستی شہناز مزمل کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کا یہ جذبہ ان کے جذبہ ءخدا خوفی کا مرہونِ منت محسوس ہوتا ہے۔ انسانیت کے حوالے سے ان کے احساسات قابلِ قدر ہیں کیونکہ ان کے نزدیک سب سے بڑا اور معتبر مذہب انسانیت ہے۔ ان کی انسان دوستی میں ایک آفاقیت اور

مثالیت کا پہلو پایا جاتا ہے۔ان کے ہاں دشمن اور دشمنی کا کوئی تصور نہیں ہے کیونکہ وہ بے پایاں اور بے لوث خلوص و مروت کی حامل ہیں۔ ان کی انسان دوستی ان کی ترقی پسند فکر کا مظہر ہے جس میں کسی نوع کا لسانی و جغرافیائی اور مسلکی و مذہبی تعصب و عصبیت روا نہیں ہے۔

دوست ہوں دوست کا ، دشمن بھی مرے اپنے
ہیں
کیوں سمجھ پائے نہیں آج تک اغیار مجھے

(ص:۲۰)

ان کے شعری بیانیے میں خود احتسابی کے رویے بھی وفور سے پائے جاتے ہیں۔ان کی فکر میں ایک غیر جانبداری کا عمل کارفرما ہے جو ان کی حقیقت پسندی سے عبارت ہے اور ان کے گہرے اعتماد کی علامت ہے۔ ان کے تنقیدی رویے ان کی بالغ نظری کو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ گردشِ دوراں کے باعث تلخیٔ حیات سے ناخوش و نالاں دکھائی دیتی ہیں۔ان کے نزدیک مادیت پسندی کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔اس لیے ان کے ہاں دنیا کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور نہ ہی اسے ثبات حاصل ہے جبکہ ان کا مطمع نظر صرف عقبیٰ ہے جو ان کی روحانیت پسندی کا مظہر ہے۔ان کی شخصیت ان کی فکر کی غمازی سے مربوط ہے، اس لیے وہ دل گرفتہ تو ہیں لیکن سوگوار نہیں ہیں۔

خود احتسابی پہ میرا مدار ہے اب تو
مجھے تو اب کسی رہبر کا انتظار نہیں
کیا ہے تلخیٔ حیات نے مجھے مایوس
نہیں نہیں مجھے دنیا کا اعتبار نہیں
مرے خیال کا ہے عکس میرے چہرے پر
میں دل گرفتہ ہوں لیکن میں سوگوار نہیں

(ص:۳۳)

شہناز مزمل کے موضوعاتی کینوس میں حقیقت پسندی کا غالب عنصر پایا جاتا ہے۔ اس حوالے سے ان کے ہاں تلخ تجربات ومشاہدات بھی پائے جاتے ہیں۔ چونکہ فکری حوالے سے ان کے مذہبی رجحانات ومیلانات فزوں تر ہیں، اس لیے ان کے ہاں استدعائی طرزِ اظہار بھی پایا جاتا ہے۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بحیثیتِ عبد ان کا اپنے معبود سے رشتہ مضبوط بنیادوں پر استوار ہے۔ وہ ایک دائیں بازو کی شاعرہ ہیں۔ اس لیے ان کے افکار وخیالات بھی مذہبی نوعیت کے ہیں۔ ان کی فکر میں توکل واستغنا اور ایثار ومروت کے خصائص نمایاں ہیں۔ وہ خدائے بزرگ و برتر سے اپنی خطاؤں کی معافی کی خواستگار ہیں اور خدا کی رضا چاہتی ہیں۔ مشیتِ ایزدی ہی ان کی حیات کا مقصود ومنتہا ہے۔ وہ خدا کی رحمت کے لامتناہی سلسلوں پر اعتماد رکھتی ہیں۔ کیونکہ وہ "لاتقنطوا من الرحمۃ اللہ" کے ارشادِ خداوندی پر عمل پیرا ہیں۔ وہ "ایاک نعبد وایاک نستعین" پر یقین رکھتی ہیں۔ صرف اس کی ہی عبادت کرتی ہیں اور اسی سے ہی مدد کی خواستگار ہیں۔ اس کی رحمت سے دعا گو رہتی ہیں۔ وہ معاشرے میں مذہبی ماحول کی خواہاں ہیں۔ وہ زندگی میں تقدس اور شرم و حیا کی پاسدار رہیں۔

ان کی ایک غزل کے پانچ اشعار مذکورہ استخراجات کے تناظر میں بطور استشہادات نذرِ قارئین ہیں۔ اشعار ہذا بحر متقارب مثمن سالم میں ہیں جس کے عروضی ارکان فعولن فعولن فعولن فعولن ہیں۔

تری بارگاہ میں جھکایا ہے سر کو
خطا معاف کردے جزا مانگتے ہیں
قدم تو بڑھایا ہے اب سوئے
منزل
الٰہی تری ہی رضا مانگتے ہیں
تری عظمتوں کا احاطہ وسیع تر
تری رحمتوں کی دعا مانگتے ہیں

سنائی دے ہر سو سے اللہ اکبر
وہی روح پرور فضا مانگتے ہیں
تقدس ہمارا مقدر بنانا
حیا کی ہم تجھ سے ردا مانگتے ہیں

(ص:۳۶-۳۷)

شہناز مزمل کے شعری بیانیے میں عظمتِ انساں کا حسین آدرش ملتا ہے۔اس حوالے سے وہ مسئلہ قدر کی پاسدار نظر آتی ہیں۔ان کے سخن میں فزوں تر قدری خصوصیات ملتی ہیں۔ان کے نزدیک انسان اپنے دائرۂ اختیار میں وسیع تر قدرت رکھتا ہے۔اس لیے مشیت اسے فتحِ کامل کی ندا دیتی ہے اور اسے قرآن مجید فرقانِ حمید کی عملی تفسیر گردانا گیا ہے۔صداقت اس کی سرشت میں شامل ہے، اس لیے اسے مخفی وغمگیں رہنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ان کا شعری اظہار جواں جذبوں کے اظہار سے مملو ہے۔جس طرح حضرت اقبالؒ نے امتِ مسلمہ کے جذبۂ حریت کو اجاگر کرنے کی سعیِ مشکور کی ہے، بعینہٖ انہوں نے بھی اسی فکری روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ان کے ہاں بھی مردِ مومن کا وہی تصور ہے جو شاعرِ مشرق کے ہاں پایا جاتا ہے۔بقول ان کے بندۂ مومن کا اگر جذبہ کامل ہو تو وہ ناقابلِ تسخیر و ناقابلِ تغیر ہے۔علوئے فکر کا یہ انداز ان کے کلام کی تاثیرات کو فزوں تر کر رہا ہے۔ان کی غزل کے چار اشعار ملاحظہ کریں جو انہیں جذبات و احساسات سے عبارت ہیں۔یہ اشعار بحر رمل مثمن محذوف میں کہے گئے ہیں جن کا عروضی وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہے۔

فتح کامل کی ندا خود تجھ کو دیتا ہے خدا
تو نہیں قرآں مگر قرآن کی تفسیر ہے
ہے صداقت تیرا شیوہ ہے جسارت تیرا کام
کیوں ہے پردے میں نہاں اور کس لئے دلگیر ہے
اُٹھ کے اب تو آزما مردِ مسلماں کا لہو

جذبہء مومن ہی مومن کے لئے شمشیر ہے
تو سمجھتا ہے زمانہ مات دے دے گا تجھے
جذبہ گر کامل ہو تو ناقابل تسخیر ہے

(ص:۳۸)

شہناز مزمل کے شعری مقاصد وہی ہیں جو کلامِ اقبال میں اقبال سے منسوب ہیں۔ وہ بندۂ مومن کو مضبوط شخصیت و کردار کا حامل قرار دیتی ہیں جسے ناقابلِ شکست کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ اس سے ان کا مقصد امتِ مسلمہ کی کردار سازی ہے جو ایک اعلیٰ وارفع پیغام ہے۔ وہ ابنائے ملت کو مثالیت و آفاقیت کے آئینوں میں دیکھتی ہیں۔ وہ انہیں زمانہ ساز کے طور پر دیکھنا چاہتی ہیں۔ وہ حق کی پاسدار و علمبردار ہیں اور باطل کی سرکوبی چاہتی ہیں۔

زمانہ ہم کو بدل ہی نہیں پایا لیکن
سبق زمانے کو ہم نے بہت سکھائے ہیں
ہمیں مٹانے کی کاوش بھی رائیگاں سمجھو
ہم حق کی راہ سے باطل مٹا کے آئے ہیں

(ص:۳۹)

رومان بھی ان کی شاعری کا تندرست و توانا موضوع ہے جس میں بے پناہ شکتی موجود ہے۔ ان کی رومان پسندی راز داری و جاں نثاری، وضع داری اور تہذیبی رکھ رکھاؤ سے عبارت ہے۔ جس سے ان کے ہاں رومان کا صاف و شفاف اور شستہ تصور اجاگر ہوتا ہے۔ ان کے ہاں طربیہ احساسات بھی ندرت کے پیرائے میں ملتے ہیں۔ وہ جذبہء محبت میں کچھ ضبط کی قائل ہیں کیونکہ اس سے راز داری کا پہلو برقرار رہتا ہے۔ بقول راقم:

اس لیے اخلاص پہ قدغن لگائی ضبط کی
عارضہ یہ بن رہا تھا وجہِ رسوائی مری

اس لیے ان کے ہاں مضبوط و مستحکم ضبط کا تصور ملتا ہے جس کا سبب ان کا پندارِ انا ہے۔ وہ ہر

حال میں اپنی شخصیت کے بھرم کو برقرار رکھنا چاہتی ہیں۔ وہ تگ وتازِ حیات میں سعیِ پیہم کا حسیں آدرش رکھتی ہیں۔ ان کے ہاں مثبت اقدار وروایات کی نمو پذیری پائی جاتی ہے۔ بسا اوقات ان کے کلام کا استفہامیہ انداز شدتِ احساس اور زورِ بیاں کو دو چند کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان کی ایک غزل کے چھ اشعار نذرِ قارئین ہیں جو بحر رمل مثمن مخبون محذوف میں ہیں جن کے عروضی ارکان فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فعلن نہیں۔ واضح رہے کہ آخری رکن میں دو زحافات کا اجتماع ہوا ہے۔ وزن ہذا اختراعی نوعیت کا حامل ہے۔

سپنا سندر سا نگاہوں میں سجا رکھا ہے
دل کے کونے میں اسے کب سے چھپا رکھا ہے
آرزؤں کا تو نادان بناتے ہیں محل
پھر بھی اک شہر تمنا کا بسا رکھا ہے
موند کے آنکھیں میں چوری سے اُسے دیکھتی ہوں
گرمیٔ بزم کو نظروں میں سما رکھا ہے
دلِ وحشی کی طنابوں کو نہ ڈھیلا چھوڑو
کس لئے دنیا میں ہنگامہ مچا رکھا ہے
کچھ بھی چھوڑا نہیں ہے گردشِ دوراں نے مگر
اپنی ہستی کا بھرم ہم نے بنا رکھا ہے
آبلہ پا تو ہیں چلتے ہیں مگر کانٹوں پر
ہم نے تو عمر سے اس طرح نبھا رکھا ہے

(ص:۴۰-۴۱)

شہناز مزمل کے شعری اظہار میں غمِ دوراں اور غمِ جاناں کے تصورات تقدیس آمیز تاثرات کے حامل ہیں۔ ان کے نزدیک ان میں سے کسی ایک سے بھی فرار ممکن نہیں ہے۔ اس لیے وہ غمِ دوراں سے کبھی الجھتی ہیں تو کبھی غمِ جاناں میں کھو جاتی ہیں۔ ان کی غزل کا ایک شعر اسی نسبت سے

ملاحظہ کریں۔شعر ہذا بحر ہزج مثمن سالم میں ہے جس کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ہیں۔

غمِ دوراں سے فارغ ہوں غمِ جاناں میں کھو جاؤں
غمِ جاناں غمِ دوراں میری تقدیس بن جائے

(ص:۵۰)

شہناز مزمل کی غزل اگرچہ کچھ کلاسیکی خصوصیات کی حامل ہے مگر ان کے ہاں کچھ رنگ معاصر غزل کے بھی ملتے ہیں۔فکری وفنی ہر حوالے سے ان کے ہاں متنوع تجربات ملتے ہیں اور ان کے ہاں مردف غزل کے شواہد ان کے ہاں بہت کم ملتے ہیں۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس سے تغزل کی روح کسی نہ کسی حد تک مجروح ہوتی ہے۔تحقیقی وتنقیدی اعتبار سے ہر سخنور کے ہاں فکری وفنی لحاظ سے ہر نوع کے تجارت کا ہونا خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔علاوہ ازیں ان کی کلیاتِ نعت میں مسلسل وغیر مسلسل ہر طرح کے غزلیہ تجربات کی جلوہ ریزی موجود ہے۔مزید برآں یہ کہ انہوں نے غزل میں مطلع ومقطع کی روایت برقرار رکھی مگر انہوں نے اس کی پابندی سختی سے خود پر روا نہیں رکھی۔اس لیے بعض اوقات وہ مطلع ومقطع کی روایت سے انحراف بھی کر جاتی ہیں۔ روایت سے بغاوت کا یہ پہلو جہاں ان کی فنی کمزوری کی علامت ہے، وہاں ان کی ندرت کا بھی مظہر ہے۔

اب ہم ان کے دوسرے مجموعہ کلام "جرأتِ اظہار" کے تناظر میں ان کے موضوعاتِ غزل کو زیرِ تجزیہ لاتے ہیں۔وہ ایک مذہبی رجحانات ومیلانات رکھنے والی شاعرہ ہیں۔ان کی فکریات پر مذہب کا عنصر مستولی نظر آتا ہے۔اس لیے ان کا بہت سا کلام استدعائی طرزِ اظہار کا حامل ہے جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دینِ متین میں دعا کو عبادت کی جان قرار دیا گیا ہے۔وہ خدا اور اس کے رسول ﷺ سے والہانہ عقیدت رکھتی ہیں۔شاید اس میں بھی ان کا فلسفہء تصوف یعنی فنا فی الرسول اللہ ﷺ اور فنا فی اللہ شامل ہے۔عاجزی وانکساری ان کے شعری اظہار کا طرۂ امتیاز ہے کیونکہ خدائے بزرگ وبرتر نے عظمت ورفعت کو جنسِ عجز وانکسار میں پنہاں رکھا ہے۔بحر ہزج

مثمن سالم میں کہا گیا ان کی غزل کا مطلع اور ایک شعر ہدیہء قارئین ہے جن کا عروضی وزن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ہے۔

یہی میری گذارش ہے یہی ہے التجا میری
بنامِ مصطفیٰؐ منظور کر مولا دعا میری
جبینِ شوق کے سجدے ہوں تیرا آستانہ ہو
نمازِ عشق جیتے جی نہ ہو یارب قضا میری

(ص:۶۱)

اسی فکری تسلسل کے حامل ان کی ایک اور غزل کے تین اشعار قابلِ ذکر ہیں۔ اشعار ہذا بحر متقارب مثمن سالم میں کہے گئے ہیں جن کے عروضی ارکان فعولن فعولن فعولن فعولن ہیں۔

نگاہِ کرم اے خدا مانگتے ہیں
ہم انسانیت کا بھلا مانگتے ہیں
چلیں تیرے محبوب کے راستے پر
یہ شام و سحر ہم دُعا مانگتے ہیں
فقیرِ محبت رہے زندگی میں
بہر گام تیری رضا مانگتے ہیں

(ص:۶۳)

شہناز مزمل کے بیانیہ کے کینوس میں وسیع تر طربیہ امکانات بھی جلوہ سامانی کر رہے ہیں۔ ان کے ہاں مظاہرِ فطرت کا بھی عمدہ استخدام کارگر ہے۔ یوں ان کا کلام فطری رچاؤ کا حامل ہو کر سراپا آمد محسوس ہوتا ہے۔ بسا اوقات ان کی ردیفیں بھی مظاہرِ فطرت کی ردا اوڑھ لیتی ہیں۔ اس پسِ منظر میں ان کی ایک غزل کے تین اشعار قابلِ غور ہیں جو بحر متدارک مثمن سالم میں کہے گئے ہیں جن کا عروضی وزن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن ہے۔

ٹوٹے یہ خامشی، کوئی ہلچل مچا

ہلکی رم جھم سی ہے کب ہوئیں بارشیں
نغمہ زن ہے فضا رقص میں ہے ہوا
میگھ ملہار گاتی پھریں بارشیں
پھول کلیوں کے ہونٹوں پہ مسکان ہے
مست سندیسے لانے لگیں بارشیں

(ص:۶۶)

زندگی نت نئی بوالعجبیوں سے عبارت ہے۔عموماً حالات غیر متوقع رہتے ہیں کیونکہ انسان امکانات کا صحیح تعین ہی نہیں کر پاتا۔خلافِ توقع معاملات کے باعث انسانی خواب تشنہء تعبیر رہ جاتے ہیں۔اس لیے انسان زندگی کو ایک سراب کا نام دیتا ہے۔وہ تخلص کے استخدام کے حوالے سے بسا اوقات نظریہء تخفیف کو بروئے کار لاتی ہیں یعنی شہناز کی بجائے ناز کا استعمال کرتی ہیں جس سے لطافت وندرت میں اضافہ ہوتا ہے جو صوتی،صوری اور سماعتی حسن کا باعث بھی ہے۔ان کے دو اشعار اس حوالے سے لائقِ توجہ ہیں۔اشعار ہذا بحر خفیف مسدس سالم مخبون محذوف میں کہے گئے ہیں جن کے عروض ارکان فاعلاتن مفاعلن فعلن ہیں۔

نت نئے سراب ملتے ہیں
یا ادھورے سے خواب ملتے ہیں
کچھ نہ کچھ تو سکوں ملے یا رب
ناز کو دکھ بے حساب ملتے ہیں

(ص:۷۰)

سماجی رویے عموماً ناہمواری کا شکار ہو گئے ہیں۔دوست دشمن کا امتیاز فرو ہو چکا ہے۔زندگی پے بہ پے الجھنوں کا شکار ہو گئی ہے۔نہ جانے کب مصائب وآلام سے رستگاری میسر آئے گی۔دل ہے کہ من مانی کرنے کے علاوہ کچھ جانتا ہی نہیں ہے اور دل کی اطاعت بہت سی کٹھنائیوں کے پیشِ خیمہ ثابت ہوا کرتی ہے۔دل نے ایسی نوبت پر پہنچا دیا ہے کہ اگر محبوبِ دل نوازنا راض ہو جائے

تو ساری خدائی دشمن محسوس ہوتی ہے۔ایک طرح کا سوز وگداز ہوتا ہے جو انسان کو اپنی ہی آگ میں جلائے رکھتا ہے۔ پھر سخنور کو صریرِ خامہ کی شعلہ نوائی ہی گوارا کرنی پڑتی ہے۔انہی ادراکات کے مظہر ان کی غزل کے پانچ اشعار قابلِ توجہ ہیں۔ یہ اشعار بحر رمل مثمن محذوف میں کہے گئے ہیں جن کا عروضی وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہے۔

دوست بن کر دوستوں کی بے وفائی دیکھئے
کج ادائی دیکھئے بے اعتنائی دیکھئے
زندگی میں ہم نے دیکھیں الجھنیں ہی الجھنیں
الجھنوں سے کس طرح ہو گی رہائی دیکھئے
زندگی کا ایک پل بھی چین سے گزرا نہیں
جب سے کی تسلیم دل کی رہنمائی دیکھئے
آپ نے ناراض ہوکر جب سے آنکھیں پھیر لیں
میری دشمن بن گئی ساری خدائی دیکھئے
جل رہی ہوں کب سے اے شہناز اپنی آگ میں
اب صریرِ خامہ کی شعلہ نوائی دیکھئے

(ص:۷۱-۷۲)

شہناز مزمل کے سخن میں معاملہ بندی کا عمدہ قرینہ بھی کارگر ہے۔ان کے افکار میں جدت و نچرت کا پہلو بھی کارفرما ہے۔ وہ محبت میں کسی نہ کسی حد تک اذیت پسندی کی قائل دکھائی دیتی ہیں۔اگر چہ توکل اور استغنا بھی ان کے طبعی خمیر میں شامل ہے، ان کے فحوائے بیان میں جمالیاتی احساس کی رعنائی بھی پورے کروفر سے پائی جاتی ہے۔مزید برآں رجائی اور طربیہ تاثرات کی حاشیہ آرائی بھی ہے۔یوں متنوع ومتضاد موضوعات کا اہتمام ان کی فکری وسعت کی دلیل قرار پاتا ہے۔

رنج و آلام سے اب جان چھڑا کر دیکھیں

ہو جو ممکن تو انہیں دل سے بھلا کر دیکھیں
خواب یادوں کے بکھرتے ہی چلے جاتے ہیں
کس لئے نیند کا احسان اٹھا کر دیکھیں؟
لذتِ درد سے محروم ہوا جاتا ہے دل
کیوں نہ پھر زخمِ محبت کوئی کھا کر دیکھیں
پاس جو کچھ ہے غنیمت ہے زمانے میں وہی
جو میسر نہ ہوا اس کی دعا کر دیکھیں
بعد مرنے کے نہ ہو پائے گی تسکینِ جمال
کیوں نہ قبر اپنی گلوں سے ہی سجا کر دیکھیں
کوئی درماندہ مسافر نہ پلٹ آیا ہو
آخر شب ہی دیا کوئی جلا کر دیکھیں

(ص:۷۳-۷۴)

شہناز مزمل محبت کو مذہب اور وفا کو اپنا مشرب گردانتی ہیں جس کے سبب ان کے ہاں مصلحت پسندی کا پہلو بھی پایا جاتا ہے۔ کہیں کہیں ان کا سخن حزنیہ طرزِ فکر کا حامل ہو جاتا ہے جس کے باعث ان کے ہاں تلخ سماجی رویے بھی آشکار ہوتے ہیں۔

میرا مذہب ہے محبت مرا مشرب ہے وفا
دشمنوں سے بھی ہے اپنوں کی طرح پیار مجھے
خامشی ہے میری احساسِ ادب کی شاہد
کون کہتا ہے نہیں جراتِ اظہار مجھے
غیر تو غیر ہیں غیروں سے گلہ ہو کیونکر
اب تو اپنے بھی سمجھنے لگے اغیار مجھے

(ص:۷۵-۷۶)

وہ وفا پرست بھی ہیں اور وفا شعار بھی ہیں مگر اہلِ جہاں کے ناز یبا رویوں کے باعث ان کا نہ صرف سماج سے اعتبار اٹھ گیا ہے بلکہ اپنی ذات پر سے بھی ان کا اعتماد ختم ہو چکا ہے۔ جسے ان کی غیر جانبداری اور تنقیدی رویوں کی انتہا کہا جا سکتا ہے۔ محبت میں ستم برداشت کرنے پر وہ محبوب کو قصوروار نہیں ٹھہراتیں بلکہ خود کو دوشی قرار دیتی ہیں۔

وفا پرست نہیں جو وفا شعار نہیں
وہ شخص کیا جسے انسانیت سے پیار نہیں
فریب کھائے ہیں دنیا میں اس قدر میں نے
ترا تو کیا مجھے اپنا بھی اعتبار نہیں
قصور میرا ہے میں نے ہی اس کو چاہا ہے
گنہ گار ہوں میں وہ گنہ گار نہیں

(ص: ۹۴-۹۵)

شہناز مزمل کے جذبات و احساسات میں مکارمِ اخلاق کی تجدید و احیا کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ وہ بغض و نفرت اور حقارت جیسے سماجی خبائث سے مبرا و ماورا ہیں۔

سبق سکھا کے وفاؤں کا بے وفاؤں کو
دلوں میں ربطِ محبت کو استوار کریں
دعائیں مانگیں شب و روز دشمنوں کے لیے
مخالفوں کو بھی ایسے خلوص و پیار کریں

(ص: ۹۷)

اب ہم ان کی کلیاتِ غزل "منتہائے عشق" مطبوعہ جنوری ۲۰۱۹ء میں موجود ان کے تیسرے مجموعہ کلام "جذب و حروف" کو موضوعاتی تناظر میں زیرِ تجزیہ لائیں گے۔ ان کا کلام جواں جذبوں کی عکاسی سے ہم آہنگ ہے۔ ان کے ہاں عزم و حوصلے کی ایک طویل داستاں ملتی ہے۔ مشکلات سے خوفزدہ ہونا ان کی سرشت میں شامل نہیں ہے۔ ان میں زندہ رہنے کی بھرپور

شکتی پائی جاتی ہے جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہیں زندگی سے پیار ہے۔ زیست سے یہی موانست انہیں زندہ رہنے کا عزم وحوصلہ دیتی ہے۔ ان کی غزل کا ایک مقطع اس حوالے سے لائقِ توصیف ہے جو بحر خفیف مسدس سالم مخبون محذوف میں ہے جس کے عروضی ارکان فاعلاتن مفاعلن فعلن ہیں۔

لاکھ شہناز مشکلیں آئیں
زندہ رہنے کا حوصلہ رکھنا

(ص:۱۱۲)

مثبت کے حوالے سے ان کے ہاں ایک احساسِ سپاس گزاری پایا جاتا ہے۔ یہ خیالات ان کے ذاتی حوالے سے بھی ہو سکتے ہیں اور محبوبِ جاں نواز کی نسبت سے بھی ہو سکتے ہیں۔ یوں وہ اپنے قاری کو ایک خوشگوار و لطیف رجائی تاثر دینے میں کامیاب و کامران ہو جاتی ہیں۔

قدرت نے تیری راہ میں شمعیں جلائی ہیں
تیری ہر ایک راہ درخشاں ہے آج کل

(ص:۱۲۱)

موضوعاتِ شعر میں جنون و خرد کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اکثر سخنور جنوں کے طرفدار ہوتے ہیں اور ان کا جھکاؤ جنوں پرستی کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔ جو ان کے جنوں کی نسبت سے تو ان کا ایک مضبوط حوالہ ہوتا ہے۔ مگر خرد کے حوالے سے ان کی فکر کا یہ ایک کمزور ترین پہلو خیال کیا جاتا ہے۔ شہناز مزمل کے ہاں بھی ہمیں جنوں کی بالادستی نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے جو ان کے داخلی اظہار کی علامت ہے اور ان کی جنوں پروری کا ایک معتبر حوالہ بھی ہے۔

پھر جنوں نے چاک کر ڈالا ہے دامانِ خرد
تذکرے میری وفاؤں کے زباں تک آ گئے

اب ہم ان کے پانچویں مجموعہ شعر "موم کے سائباں" کو موضوعاتی پسِ منظر میں زیرِ بحث لاتے ہیں۔ مجموعہ ہذا کا نام بھی خود میں ایک ندرت کا پہلو لیے ہوئے ہے۔

ان کی فکریات میں احساسِ ذات کا پہلو نمایاں ہے جسے ان کے داخلی اظہار سے عبارت کیا جاسکتا ہے۔ ندرتِ فکر اور موضوعاتی جدت بھی ان کے ہاں نمایاں ہے۔ نو بہ نو مضامین ہیں جو بہار سامانی کر رہے ہیں۔ ان کے ہاں ایک مضبوط و مستحکم پندارِ انا بھی ہے جو ان کی بے باکیٔ فکر کی علامت ہے۔

اسیرِ ذات رہے اعتراف کیسے ہو؟
خود اپنے آپ سے کچھ انحراف کیسے ہو؟
فصیلِ شہر کو خود اپنے ہاتھ سے توڑا
نقیبِ وقت سے اب اختلاف کیسے ہو؟
تمام عمر گریزاں رہے زمانے سے
یہ جرم اپنی انا کا معاف کیسے ہو؟

(ص:۱۷۰)

وسیع تر رجائی امکانات ان کے فکری کینوس کا حصہ ہیں جس سے خوش گواریٔ احساس کی نمو پذیری میں مدد ملتی ہے۔ سماجی ادراکات ان کی شاعری کا معتبر حوالہ ہیں۔ کہیں کہیں ان کے ہاں انا اور ضد کے مابین ایک تصادم کی فضا محسوس ہوتی ہے جس سے وہ چھٹکارا پانا چاہتی ہیں۔ ان کی شعریات میں عزمِ صمیم کی عکاسی ہوتی ہے۔ یوں وہ مشکل پسند دکھائی دیتی ہیں۔

فضائیں مرتعش سی ہیں سکوتِ شام ٹوٹا ہے
مرے روٹھے خدا نے پھر مجھے شاید پکارا ہو
روابط بھی علامت زندگی کی بنتے جاتے ہیں
ضرورت ہو مری یا واسطہ کوئی تمہارا ہو
اَنا اضداد کے گرداب میں گھرتی ہی جاتی ہے
خدایا اس سمندر کا کوئی آخر کنارا ہو
مخالف سمت منزل ڈھونڈنا عادت رہی اپنی

ہوا کے دوش پر شہناز کا کیسے گذارا ہو؟

(ص:۱۷۲-۱۷۳)

اگر ان کے نظریہءمحبت کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ مبینہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ محبت کے راستے میں ان کی انا ان کے لیے بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔ گویا وہ اپنی انا پر کسی نوع کا سمجھوتا نہیں کرتیں۔ بحر خفیف مسدس سالم مخبون محذوف میں کہا گیا ان کی غزل کا یہ شعر خصوصی اہمیت کا حامل ہے جس کا عروضی وزن فاعلاتن مفاعلن فعلن ہے۔

رابطہ استوار کیسے ہو
خواہشوں پر انا کا پہرہ ہے

(ص:۱۷۴)

شہناز مزمل کے ہاں حزنیہ حوالے سے بھی فزوں تر امکانات ملتے یں۔ یوں ان کے ہاں ایک کشمکش کی کیفیت نمایاں ہوتی ہے۔ یوں مصائب و آلام کا مذکور بھی سامنے آتا ہے۔ اگر چہ وہ پاسدارِ انا ہیں مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ صبر جیسی نعمتِ غیر مترقبہ سے مالا مال بھی ہیں۔

غم مجھ سے کسی طور سمیٹا نہیں جاتا
پہرا ہے مری سوچ پہ بولا نہیں جاتا
اب دل کے دھڑکنے کی صدا بھی نہیں آئی
اور قریہ ءِ خواہش سے بھی نکلا نہیں جاتا
ہر روز نشیمن پہ مرے گرتی ہے بجلی
گھر مجھ سے نیا روز بنایا نہیں جاتا
ہم اپنی اناؤں کا بھرم رکھتے ہیں شہناز
ہر بات پہ طوفان اُٹھایا نہیں جاتا

(ص:۱۷۹-۱۸۰)

ان کے ہاں استفہامیہ اشارات کا ورود ان کے حسیاتی و نفسیاتی اور فلسفیانہ عمق کی غمازی

سے عبارت ہے جس کی بدولت قاری کے لیے تجسس اور حیرت و استعجاب کے ابواب وا ہوتے ہیں۔مزید برآں شدتِ احساس کے پہلو بہ پہلو زورِ بیان میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

سماعتوں پہ مری آج کیسی دستک ہے؟
کوئی ہوا سے پتا میرا پوچھتا ہو گا
وہ شخص میرا شناسا نہیں تو کون ہے وہ
کسی کو ڈھونڈتے رستہ بھٹک گیا ہو گا
بدلتی رُت میں وہ کیسا بدل گیا شہناز
بچھڑ کے مجھ سے کبھی وہ بھی سوچتا ہو گا

(ص:۱۹۰-۱۹۱)

اسی فکری تسلسل کی روایت کا اعادہ ان کی ایک اور غزل کے ایک اور شعر میں ملاحظہ کریں۔

ان کے ہاں پندارِ ذات کے مضبوط و توانا شواہد جا بجا ملتے ہیں۔اسی انا کے باعث ہی انہیں عظمتِ کردار میسر آئی ہے۔کہیں کہیں ان کے ہاں موضوعاتی کرشمہ کاری کا پہلو بھی نمودار ہوتا ہے جس کا ایک انداز جنوں اور تصوف کا ہم آغوش ہونا بھی ہے۔

گریز پا ہوں کوئی نقشِ پا ملے نہ ملے
اَنا جو ذات سے ٹکرا گئی تو کیا ہو گا
جنوں کی آخری منزل میں بے خودی میری
لباس روح کو پہنا گئی تو کیا ہو گا

(ص:۱۹۳)

شہناز مزمل کی انا میں بھی ایک معقولیت و منطقیت کا پہلو پایا جاتا ہے۔گویا ان کی انا بھی خود میں ایک جواز اور بہت سے امکانات رکھتی ہے۔یعنی ان کی انا میں لایعنیت اور عدم مقصدیت مفقود ہے۔

بہت ٹکرائے ہیں اپنی انا کے پتھروں سے ہم

مگر گرتی ہوئی دیوار سے ماتھا نہیں پھوڑا

(ص:۱۹۴)

رومان ان کی شاعری کا ایک ہر دلعزیز اور مقبول ترین موضوع ہے جبکہ اس کے برعکس حزن وملال ان کا ایک پرتاثیر موضوع ہے جس کی پذیرائی کبھی ماند نہیں پڑتی۔

متاعِ زیست لٹا کر کوئی ملال نہ تھا
بجز تمہارے کسی کا مجھے خیال نہ تھا
عذاب جاں پہ مری ہر گھڑی مسلط تھے
میرے نصیب میں خوشیوں کا کوئی سال نہ تھا

(ص:۲۰۲)

اب ہم ان کے چھٹے مجموعہء کلام "میرے خواب ادھورے ہیں" کو موضوعاتی تناظر میں زیرِ بحث لاتے ہیں۔ان کے ہاں انقلاب اور مزاحمت کے حوالے سے فزوں تر امکانات ملتے ہیں۔ یوں ان کا سخن ترقی پسند فکر سے ہم آغوش ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔جس سے انسان دوستی کا حسین آدرش ملتا ہے۔اسی حوالے سے ان کی غزل کے دو اشعار لائقِ توجہ ہیں جو بحر ہزج مثمن سالم میں کہے گئے ہیں جن کا عروضی وزن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ہے۔

یہاں پر غاصبوں اور خود پرستوں نے کیا قبضہ
مٹا کر یہ جہاں دنیا نئی تعمیر کرتے ہیں
خود اپنا سر ہتھیلی پر سجا کر سُوئے مقتل ہم
کسی صورت ہم اپنی فکر کو زنجیر کرتے ہیں

(ص:۲۲۲)

ان کی شاعری میں ہجر کا کرب بھی اپنی پوری شدت سے ملتا ہے جس کے باعث ان کے سخن میں اک طرح کا سوز و گداز پیدا ہو جاتا ہے۔

ہجر کی چادر اوڑھ کے سر پر چلتی ہوں

اپنی آگ میں تنہا خود ہی جلتی ہوں

(ص:۲۲۳)

شہناز مزمل کے طرزِ بیان میں ندرتِ فکر کے عمدہ شواہد ملتے ہیں جنہیں ان کی موضوعاتی جدت سے تعبیر کبھی کیا جا سکتا ہے۔ جس کی بدولت ان کے ہاں تنقیدی رویے بھی نمو پذیر ہوتے ہیں۔ بحر رمل مثمن محذوف میں کہا گیا ان کی غزل کا ایک شعر لائقِ توجہ ہے جس کا عروضی وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہے۔

حضرتِ انسان جب انسانیت سے گر گئے
فرضِ انساں بھی فرشتوں کو ادا کرنا پڑا

(ص:۲۲۴)

ان کے فکری کینوس میں انا انسانی کردار کی بہت بڑی خوبی کے طور پر سامنے آئی ہے جسے انسان کی عظمت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جسے ہم انا کا ایک مثبت پہلو قرار دے سکتے ہیں۔ یوں انا اور ضد کے مابین ایک خطِ امتیاز بھی قائم ہوتا ہے۔

سودا نہیں کرتے جو کبھی اپنی انا کا
ہے سچ کہ زمانے میں وہی لوگ بڑے ہیں

(ص:۲۲۶)

اگر مسئلہ جبر و قدر کے حوالے سے بات کی جائے تو ان کے ہاں جبر و قدر کے مابین ایک توازن کی فضا قائم ہے جو اس کی خوبصورتی کی علامت ہے۔

کسی پہ اتنا بھی تقدیر کا حصار نہ ہو
خود اپنے آپ پہ اپنا ہی اختیار نہ ہو

(ص:۲۳۷)

طولِ بیان کا خوف مانع ہے کیونکہ ہم نے قاری کی طبعِ نفیس کو بھی ملحوظِ خاطر رکھنا ہے، اس لیے ہم سلسلہء تحریر کو موقوف کرتے ہیں۔ ویسے تو ان کے موضوعاتی تناظر کے حوالے سے لکھنے

کے لیے دفتروں کے دفتر درکار ہیں۔ اس حوالے سے کم سے کم پی ایچ۔ ڈی کے مقالے کی ضرورت ہوگی۔ ہمارے مرقومہ استشہادات واستخراجات مشتے از خروارے کے بمصداق ہیں لیکن اس امر کی مبینہ دلیل ہیں کہ شہناز مزمل وسیع تر موضوعاتی کینوس کی حامل ہیں۔ ان موضوعات میں تنوع بھی ہے اور تضاد بھی ہے۔ عمومیت بھی ہے اور اختصاصیت بھی ہے۔ گویا ان کے ہاں موضوعات کی ایک قوسِ قزح ہے جو قارئین پر اپنے رنگ بکھیر کر ان کی خوشگواریٔ احساس کو فزوں تر کر رہی ہے۔

باب دوازدہم

ڈاکٹر شہناز مزمل کا عمومی طرزِ اظہار

شاعری کو لسانی اور فکری اعتبار سے عام طور پر دو اقسام میں منقسم کیا جاتا ہے۔ پہلی قسم کے طرزِ سخن میں ایسا کلام شامل ہے جو لسانی اور فکری اعتبار سے سہل تر ہوتا ہے۔ جس میں کسی نوع کی دقیقہ سنجی کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اسلوبیاتی اعتبار سے ایسا سخن سہلِ ممتنع کے زیادہ قریں ہوتا ہے اور ایسے کلام سے ہر ذہنی سطح کا قاری استفادہ کر سکتا ہے۔ ایسی شاعری عوامی شاعری کے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ جس میں بے پناہ ابلاغیت ہوتی ہے۔ جبکہ دوسری قسم میں ایسا کلام ہوتا ہے جو ہر اعتبار سے مشکل ہوتا ہے۔ جس میں ادق و دقیق الفاظ و خیالات کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ شاعر فکری و فنی اور لسانی اعتبار سے اپنی علمیت اور فن کی دھاک بٹھاتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جس میں شوکتِ الفاظ کچھ زیادہ ہی دخیل ہوتی ہے۔ شہناز مزمل کا کلام بھی مذکورہ قبیلِ اول سے تعلق رکھتا ہے۔ ان

کا سخن سادہ و عام فہم ہے۔انہوں نے سہل نگاری کی روایت کو تقویت بخشی ہے۔شذرہ ہذا میں ہم ان کی شاعری کا تجزیہ عمومی طرزِ اظہار کے تناظر میں کریں گے۔اس سلسلے میں ہم ان کی کلیاتِ غزل "منتہائے عشق" میں موجود ان کے ساتویں شعری مجموعے "عشق تماشا" میں سے منتخب شعری استشہادات برائے استخراجات لائیں گے۔

زندگی کا کوئی بھی شعبہ ہو تو اس میں کچھ نازیبا رجحانات فروغ پاتے ہیں۔ایسے معاملات ان لوگوں کی اختراع ہوتے ہیں جو بالیدگیٔ فکر سے عاری ہوتے ہیں۔یہی صورتِ حال کچھ جہانِ شعر میں بھی ہے۔ہمارے اکثر و بیشتر شعرا جو احساسِ کمتری کا شکار ہوتے ہیں، وہ مشکل نگاری کو ترجیح دیتے ہیں۔یوں خود کو منوانے کی سعیِ نامشکور کرتے ہیں حالانکہ یہ ایک تجربہ شدہ حقیقت ہے کہ ایک شاعر کی شعری ریاضت جتنی زیادہ ہوتی ہے تو فکری و لسانی اعتبار سے اس کی شاعری زیادہ لبرل ہو جاتی ہے اور اس میں ابلاغی خصوصیات فزوں تر ہو جاتی ہیں۔مشکل نگاری کے حامل شعرا کا کلام ابلاغیت کی دولت سے محروم ہو جاتا ہے اور وہ ادب میں وہ مقام حاصل نہیں کر پاتے جس کے وہ خواہاں ہوتے ہیں۔بفضلِ تعالیٰ شہناز مزمل کے ہاں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔انہوں نے اپنی شعریات میں عام آدمی کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔وہ شعری حوالے سے جمہوری نکتۂ نظر کی حامل ہیں۔

رومانوی حوالے سے بھی ان کے ہاں عمومی نکتۂ نظر پایا جاتا ہے۔اس سلسلے میں انہوں نے اساطیری تلمیحات کا استخدام کیا ہے جن کا تعلق لوک داستانوں سے ہے۔یوں محبت کے حوالے سے ان کا موقف واضح طور پر سامنے آتا ہے۔عشق و محبت میں پیا ہونے والی کیفیات کو انہوں نے بلیغ انداز میں پیش کیا ہے۔

کبھی میں بن گیا مجنوں کبھی بنا رانجھا
بچھڑ کے تجھ سے عجب اپنا حال میں نے کیا

(ص:۲۶۱)

بسا اوقات وہ سادگی و پرکاری کا ایسا مظاہرہ کرتی ہیں کہ قاری حیران و ششدر رہ جاتا ہے۔

یوں ان کی سہل نگاری بیان کا قرینہ قرار پاتی ہے۔اس حوالے سے ان کی ایک غزل کا شعر دیکھیے جو بحر رمل مثمن محذوف میں کہا گیا ہے جس کے عروضی ارکان فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہیں۔

چھاؤں کی لذت بھلا سورج کو کب معلوم ہے؟
جلتے سورج کے تلے ہی دور تک سایہ گیا

(ص:۲۶۸)

انتشارِ ذات ایک مشکل اور ثقیل نوعیت کا موضوع ہے مگر جس خوب صورتی اور سادگی و پرکاری سے انہوں نے اسے موضوعِ شعر بنایا ہے، وہ قابلِ داد ہے۔ بحر ہزج مسدس محذوف میں کہا گیا ان کا یہ شعر لائقِ توجہ ہے جس کا عروضی وزن مفاعیلن مفاعیلن فعولن ہے۔

میں اپنے آپ کو کیسے سمیٹوں؟
اکائی ذات کی بکھری پڑی ہے

(ص:۲۷۱)

وہ بڑے بڑے فلسفیانہ موضوعات کو بھی انتہائی سادگی و سہولت کے پیرائے میں پیش کر جاتی ہیں کہ قاری محوِ حیرت رہ جاتا ہے۔اسی حوالے کا مظہر ان کی ایک غیر مردف غزل کا یہ شعر دیکھیے جس میں ذات کی بازیافت کو موضوعِ شعر بنایا گیا ہے۔

اپنی تلاش کرتے زمانہ گزر گیا
میں کون ہوں میں کس لیے دنیا میں آ گئی

(ص:۲۷۵)

ان کے عمومی طرزِ سخن میں مظاہرِ فطرت کا استخدام خصوصی اہمیت کا حامل محسوس ہوتا ہے جس سے ان کا کلام فطری رچاؤ کی ردا اوڑھ لیتا ہے۔

بہت ہی دیکھ لیں شب کی طوالتیں اب
تو
نئی امید کے سورج ذرا نکل تو سہی

(ص:۲۷۶)

ان کے فحوائے بیان میں عمومیت کے پہلو بہ پہلو ایک قطعیت کا عنصر بھی نمایاں ہے جس میں معروضیت بھی ہے اور منطقیت بھی ہے۔ بحر ہزج مسدس محذوف میں کہا گیا ان کا یہ شعر قابلِ توجہ ہے جس کا عروضی وزن مفاعیلن مفاعیلن فعولن ہے۔

تجھے ہر حال میں سننا پڑے گا
غلط ہے یا صحیح ہے فیصلہ ہے

(ص:۲۷۷)

مشکل سے مشکل موضوعات کو سلیس انداز میں پیش کرنے میں وہ یدِ طولیٰ رکھتی ہیں جسے ان کی پیش کش کا کمال گردانا جا سکتا ہے۔ مشکل اظہار کو وہ لایعنیت اور عدم مقصدیت سے ہم آہنگ قرار دیتی ہیں۔ اسی نسبت سے ان کا یہ شعر لائقِ توجہ ہے۔

دشمن ہے پرندوں کا بدلتا ہوا موسم
گھر ان کا کسی پیڑ پہ رہنے نہیں دیتا

(ص:۲۸۴)

شہناز مزمل کا جذبات و احساسات کی پیش کش کا انداز نادر النظیر ہے۔ وہ عمومی موضوعات کو خصوصی انداز میں اور اختصاصی افکار کو عمومیت آمیز انداز میں پیش کرتی ہیں۔ یوں ان کے ہاں عمومی اور خصوصی اظہار کا اجتماع ممکن ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بیان کی جملہ نفاستوں اور نزاکتوں سے بہ حسن و خوبی آشنا ہیں۔ امر ہذا ان کی لسانی چابکدستی اور فنِ رعایت لفظی کا عکاس ہے۔ عمومی طرزِ اظہار میں وہ مشکل رموز و علائم سے راہِ گریز اختیار کرتی ہیں۔ اسی نسبت سے ان کی غزل کا یہ مطلع نذرِ قارئین ہے جو بحرِ خفیف مسدس سالم مخبون محذوف میں ہے جس کے عروضی ارکان فاعلاتن مفاعلن فعلن ہیں۔

بااثر ہو کہ بے اثر ٹھہرے
بات وہ ہے جو معتبر ٹھہرے

(ص:۲۸۵)

ان کے شعری پیرائے میں جہاں اظہار کی سادگی ہے وہاں راز داری کا پہلو بھی عمدگی کا مظہر ہے کہ سب کچھ کہنے کے باوجود بھی سب کچھ بادی النظر میں ان کہا رہ جاتا ہے جسے بنظرِ غائر دیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔اس حوالے سے وہ رعایتِ لفظی سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھاتی ہیں۔

خموشیوں کی زباں ہی زباں نہ بن
جائے
اُٹھی نظر کا جھکانا بہت ضروری تھا

(ص:۲۸۷)

ان کا جہانِ موضوع بسیط و عریض ہے۔ان کے ہاں تمام تر شعبہء حیات سے موضوعات ملتے ہیں۔جن میں عمرانی و سماجی پہلو بھی پنہاں ہیں۔ان کے ہاں کلاسیکی شاعری کا بہاریہ رنگ بھی عمدگی سے ملتا ہے۔

تتلی تو چرا لیتی ہے پھولوں کے سبھی
رنگ
جگنو تو چراغوں پہ بھروسا نہیں کرتا

(ص:۲۹۱)

عمومیت آمیز سخن کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی ان کے ہاں اختصاصی زاویے بھی نمو پاش ہوتے ہیں۔یوں ان کے کلام کا نفسیاتی و حسیاتی اور فلسفیانہ گراف بلند ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور ان کی فکری نادرہ کاری کی دلیل ہے۔اسی حوالے سے بحر ہزج مسدس محذوف میں کہا گیا ان کا یہ شعر لائقِ توجہ ہے جس کا عروضی وزن مفاعیلن مفاعیلن فعولن ہے۔

کوئی آہٹ ہو لمحے جاگ جائیں
خموشی جان لیوا ہو گئی ہے

(ص:۲۹۲)

تحقیقی وتنقیدی حوالے سے کچھ غلط تاثرات فروغ پا رہے ہیں جو کسی بھی نوع کی منطقیت سے عاری ہیں۔ عام طور پر یہ خیال پایا جاتا ہے کہ عمومی طور اظہار کا حامل شعر تاثیرات سے محروم ہوتا ہے حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اگرچہ ذیل میں دیا گیا شعر اظہار کی سادگی سے عبارت ہے لیکن صنعتِ تلمیح کے التزام کے باعث اس کی تاثیراتی اہمیت دو چند ہوگئی ہے۔

اس عہد کے یزید کا کس سے کریں گلہ؟
خیمے تمام اپنے ہی ہاتھوں سے جل گئے

(ص:۲۹۸)

اگرچہ شہناز مزمل کا شعری اظہار مکمل سادگی کا مظہر ہے مگر اس کے باوجود بھی وہ جزئیات نگاری کا پورا پورا اہتمام رکھتی ہیں۔ یوں منظر نگاری کا حسین قرینہ بھی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ یوں ان کا فکری کینوس زرخیز ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جس سے بین الشعر معنی آفرینی، اثر آفرینی اور موضوع آفرینی کے خصائص پیدا ہو جاتے ہیں۔

ہے تار تار تری یاد کا حسیں ملبوس
کہاں سے لاؤں رفو گر پھٹی قبا کے لیے

(ص:۳۶۰)

وہ حرف کی حرمت کی قائل ہیں وہ شبدوں کے احترام کے ہنر سے بخوبی واقف ہیں۔ اس لیے کوئی بھی لفظ ان کے ہاں حقیر نہیں ٹھہرتا بلکہ مناسب وقت پر اسے بھی خدمت کا موقع دیا جاتا ہے۔ الفاظ سے یوں رواداری کا رویہ ان کے لسانی تقدس کی علامت ہے۔

دو گھڑی کو ہی چلے آتے تسلی دینے
درد جو بخشا تھا اسی درد کا درماں کرتے

(ص:۳۱۱)

ان کے اظہار کی سادگی الفاظ وخیالات کو ایک منطقیت عطا کرتی ہے اور یوں ان کے ہاں تعقیدِ لفظی ومعنوی کے خصائص پیدا ہو جاتے ہیں۔ شبدوں کا عمدہ استخدام ان کے لسانی تبحر کی

دلیل ہے۔

طوفاں سے نکلنے میں ذرا دیر لگے گی
کشتی کو سنبھلنے میں ذرا دیر لگے گی

(ص:۳۱۲)

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ جو تاثر عمومی اظہار کے حامل شعر میں ہوتا ہے۔ وہ خصوصی اظہار کے شعر میں نہیں ہوتا۔ اس میں یہ منطق کارفرما ہے کہ عمومیت میں وہ ابلاغیت ہوتی ہے جو اختصاصی اظہار کے حامل اشعار میں نہیں ہوتی۔ زندگی کا کوئی بھی شعر ہو سادگی کی اہمیت مسلمہ رہتی ہے۔ یہی معاملہ جہانِ شعر و سخن کا بھی ہے۔ بحر ہزج مسدس محذوف میں کہا گیا ان کا یہ شعر خصوصی اہمیت کا حامل ہے جس کے عروضی ارکان مفاعیلن مفاعیلن فعولن ہیں۔

ٹھکانہ مجھ کو مشکل سے ملا ہے
کہیں جاتی نہیں کھونے کے ڈر سے

(ص:۳۱۵)

مذکورہ استشہادات و استخراجات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ شہناز مزمل کا عمومی طرزِ اظہار سادگی و پرکاری کا مظہر ہے جس میں قرینہ کاری کی جدت بھی ہے اور کرشمہ کاری کا تحیر بھی پنہاں ہے۔ ان کے کلام کا ایک استخراجی پہلو یہ بھی ہے کہ اظہار کی سادگی کے باوجود تاثیرات اور شعریت کی چاشنی میں کسی نوع کی کمی کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ یوں قاری ان کے کلام کی مکمل گرفت میں رہتا ہے اور اس کے حواس مستعد رہتے ہیں۔

تمت بالخیر

ڈاکٹر شہناز مزمل کی تخلیقات وتحقیقات

1۔ابتدائے عشق	(مجموعۂ کلام)
2۔عشق تماشا	(مجموعۂ کلام)
3۔عشق مسافت	(مجموعۂ کلام)
4۔عشقِ مسلسل	(مجموعۂ کلام)
5۔عشق دا دیوا	(پنجابی مجموعۂ کلام)
6۔عشق دا بھانبھڑ	(پنجابی مجموعۂ کلام)
7۔عشقِ کل	(مجموعۂ کلام)
8۔انتہائے عشق	(مجموعۂ کلام)
9۔نورِ کل	(مجموعۂ کلام)
10۔جادۂ عرفاں	(مجموعۂ کلام)
11۔بعد تیرے	(مجموعۂ کلام)
12۔قرضِ وفا	(مجموعۂ کلام)
13۔میرے خواب ادھورے ہیں 14۔موم کے سائباں	(مجموعۂ کلام)
15۔جراتِ اظہار	(مجموعۂ کلام)
16۔جذب وحروف	(مجموعۂ کلام)
17۔پیامِ نو	(مجموعۂ کلام)
18۔عکسِ دیوار پہ تصویر	(مجموعۂ کلام)
19۔شہناز مزمل کے منتخب اشعار	(انتخابِ شعر)
20۔کھلتی کلیاں مہکتے پھول	(مجموعہ کلام)

21۔ Ten poets of today		(انگریزی)
22۔نورِفرقان (قرآن پاک کا منظوم مفہوم)		(تحقیق/شاعری)
23۔کتابیاتِ اقبال		(تحقیق)
24۔کتابیات مقالہ جات		(تحقیق)
25۔لائبریریوں کا شہر لاہور		(تحقیق)
26۔فروغِ مطالعہ کے بنیادی کردار		(تحقیق)
27۔عکسِ خیال		(مضامین کا مجموعہ)
28۔دوستی کا سفر		(سفرنامہ)
29۔نماز		(بچوں کے لیے)
30۔منتہائے عشق	کلیاتِ شہناز مزمل	(غزلیات)
31۔ندائے عشق	کلیاتِ شہناز مزمل	(نظمیات)
32۔کلیاتِ شہناز مزمل		(ادبِ اطفال)
33۔کلیاتِ شہناز مزمل		(پنجابی کلام)
34۔کلیاتِ عشق		(تصوف)
35۔سفرِ عشق		(سفرنامہءحرمین شریفین وجدہ)
36۔اجلاکون میلاکون		(کالموں کا مجموعہ)
37۔بریف کیس		(کہانیاں)

شبیر ناقدؔ کی گراں قدر تخلیقی تصانیف

۱۔شاعری کی مطبوعہ کتب:

۱-صلیبِ شعور (غزلیات ونظمیات)	۲۰۰۷ء
۲-من دی مسجد (سرائیکی شاعری)	۲۰۱۰ء
۳-آہنگِ خاطر (غزلیات ونظمیات، گیت، قطعات)	۲۰۱۱ء
۴-جادہ فکر (غزلیات ونظمیات)	۲۰۱۴ء
۵-صبحِ کاوش (غزلیات، نظمیات)	۲۰۱۵ء
۶۔دل سے دور نہیں ہوتم (غزلیات ونظمیات)	۲۰۱۶ء
۷۔کتابِ وفا (مجموعہ غزل)	۲۰۱۶ء
۸-گنجِ آگہی (مجموعہءغزل)	۲۰۱۶ء
۹۔روح دی روہی (سرائیکی شاعری)	۲۰۱۶ء
۱۰۔جہانِ عقل وجنوں (اردو شاعری)	۲۰۱۷ء
۱۱۔زادِ سخن (اردو شاعری)	۲۰۱۷ء
۱۲۔حسنِ خیال (اردو شاعری)	۲۰۱۸ء
۱۳۔رتجگوں کا سفر (اردو شاعری)	۲۰۱۸ء
۱۴۔طرزِ بیاں (اردو شاعری)	۲۰۱۸ء
۱۵۔عکاسِ احساس (اردو شاعری)	۲۰۱۸ء
۱۶۔نقدِ فکر ونظر (غزل ونظم)	۲۰۱۹ء
۱۷۔ریاضِ دانش (مجموعہءغزل)	۲۰۱۹ء
۱۸۔ضیافتِ اطفال (بچوں کیلئے شاعری)	۲۰۱۹ء
۱۹۔شہرِ سخن (مجموعہءکلام)	۲۰۱۹ء
۲۰۔نوائے شوق (مجموعہءکلام)	۲۰۲۱ء
۲۱۔سک داسیک (سرائیکی مجموعہءکلام)	۲۰۲۲ء
۲۲۔کلیاتِ شبیر ناقد (اردو، جلد اول)	۲۰۲۳ء

۲۔گراں قدر تحقیقی وتنقیدی مطبوعہ کتب:

۱-ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا کیف غزل (شخصیت اور فن)	۲۰۱۳ء
۲-شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ اول) تنقیدی مضامین ومنتخب کلام	۲۰۱۳ء
۳-شاعراتِ ارضِ پاک حصہ دوم) تنقیدی مضامین ومنتخب کلام	۲۰۱۳ء
۴-شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ سوم) تنقیدی مضامین ومنتخب کلام	۲۰۱۳ء
۵-نقدِ فن (تنقیدی مضامین)	۲۰۱۴ء
۶-شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ چہارم) تنقیدی مضامین ومنتخب کلام	۲۰۱۴ء
۷-شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ پنجم) تنقیدی مضامین ومنتخب کلام	۲۰۱۵ء
۸-شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ ششم) تنقیدی مضامین ومنتخب کلام	۲۰۱۵ء
۹۔شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ ہفتم) تنقیدی مضامین ومنتخب کلام	۲۰۱۶ء
۱۰۔تلمیحاتِ فضاؔ اعظمی (تنقید وتحقیق)	۲۰۱۶ء
۱۱-شاعراتِ ارضِ پاک جامع ایڈیشن (حصہ اول)	۲۰۱۶ء
۱۲۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا منشورِ نظم (نظمیاتی تجزیہ)	۲۰۱۶ء
۱۳-میزان تنقید (تنقیدی مضامین)	۲۰۱۷ء
۱۴-تنقیدات (تنقیدی مضامین)	۲۰۱۸ء
۱۵۔سفرنامہ نگاری کے انتقادی امکانات (حصہ اول)	۲۰۱۸ء
۱۶۔شاعراتِ ارضِ پاک (جامع ایڈیشن) جلد دوم	۲۰۱۸ء
۱۷۔فضاؔ اعظمی کی شاعری (تلمیحات کے آئینے میں) اضافہ شدہ ایڈیشن	۲۰۱۹ء
۱۸۔تناظرات (تحقیق وتنقید)	۲۰۲۲ء
۱۹۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا آئینۂ فکر وفن (تحقیق وتنقید)	۲۰۲۲ء
۲۰۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے تخلیقی خدوخال (تحقیق وتنقید)	۲۰۲۲ء
۲۱۔شاہدہ لطیف کا تخلیقی ارتقا (تحقیقی وتنقیدی تجزیاتی مطالعہ)	۲۰۲۳ء
۲۲۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی ترجیحاتِ فکر وفن (تحقیق وتنقید)	۲۰۲۳ء
۲۳۔ڈاکٹر شہناز مزمل کے تخلیقی آفاق	۲۰۲۳ء